یہ میرا بلتستان

سلمیٰ اعوان



یہ میرا بلتستان

سلمیٰ اعوان

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

اُن شُہداء کے نام

جنہوں نے بلتستان کی جنگ آزادی میں حیرت انگیز

کارنامے سرانجام دیئے، اور شہید ہوئے۔

اُن غازیوں کے نام

جنہوں نے صرف اور صرف جذبہ ایمانی کے زور پر

یہ جنگ جیتی، پاکستان میں شامل ہوئے اور آج بھی

اس کی محبت سے سرشار ہیں۔

حرفِ آغاز

یہ سکردو میں میرے قیام کی آخری شام تھی، اس وقت جب قراقرم اور ہمالیائی سلسلوں کی چوٹیوں کو سورج کی آخری کرنیں بوسے دے رہی تھیں۔ میں وادیٔ سکردو کے دانشوروں کے ساتھ محوِ گفتگو تھی۔ دفعتاً سکردو ڈگری کالج کے پرنسپل خواجہ مہرداد خان نے مجھ سے کہا۔

آپ اگر بلتستان پر ایک دستاویزی کتاب تیار کریں تو ہم اس کی اشاعت کا بندوبست نہ صرف اردو زبان میں کریں گے بلکہ اس کا جرمن زبان میں ترجمے کا اہتمام بھی ہوگا، بون یونیورسٹی کا بلتی ڈیپارٹمنٹ اس ضمن میں آپ کو موزوں رائلٹی دے گا۔

محفل میں بون یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کلازسیگاسٹر بھی موجود تھے۔ وہ بلتی زبان پر تحقیقی سلسلے میں میرے ساتھ ہی اسلام آباد سے سکردو پہنچے تھے۔ اس تجویز پر ان کا سلور گرے بالوں والا سر تیزی سے اثبات میں ہلا تھا۔

میں ہنس پڑی تھی۔

دراصل پیسہ کمانا ہی مقصود ہوتا تو پھر یہاں آنے اور ان وادیوں میں خاک چھاننے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو اُلٹے سیدھے ناول لکھنے سے حاصل ہو سکتا تھا۔ خواجہ صاحب میں چاہتی ہوں میرے ملک کے عام لوگ اپنے وطن کے ان دشوار گزار گوشوں کے بارے میں جانیں۔ میں کتاب کو اتنا بوجھل اور ثقیل بنانا نہیں چاہتی ہوں کہ عام قاری اس کے چند ورق پڑھنے کے بعد اسے پرے پھینکتے ہوئے خود سے کہے۔

’’ہنا ڈیار کیا بور شے ہے۔‘‘

میری خواہش ہے کہ میں اس کے تاریخی پس منظر میں جھانکتے ہوئے اس کے مسائل، اس کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو اس انداز میں بیان کروں کہ قاری پڑھتا جائے اور جب وہ اسے پڑھ لے تو یہ جان لے کہ بلتستان کیا ہے؟ تب شاید ایسا ممکن ہو کہ کسی خوبصورت سی محفل میں کوئی پڑھی لکھی عورت سکردو یا خپلو کے نام پر یہ نہ کہے۔

ارے سکردو، مائی گاڈ، وہ کہاں ہے؟

آپ دعا کریں میں اس مقصد میں کامیابی حاصل کروں۔

اور غلام وزیر مہدی سابق رُکن مجلسِ شوریٰ مسکرائے اور میرے شانے محبت سے تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

آپ کا جذبہ قابلِ صد ستائش، ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں۔

میں جناب مہرداد خان کی شکرگزار ہوں جنہوں نے بلتستان میں میرے قیام کو ہر طرح مفید بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ جناب غلام وزیر مہدی کا بہت شکریہ کہ جنہوں نے قدیم تاریخ کے بہت سے باب میرے اوپر کھولے، طاہر، عباس کاظمی، روزی خان اور جناب حاتم خان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مجھے جناب محمد یوسف حسین آبادی کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ہے۔ سچی بات ہے انہوں نے اس کتاب کے لیے جس طرح میری قلمی معاونت کی۔ میرے شکریے کے چند الفاظ میرے دلی جذبات کی ترجمانی کرنے سے قطعی معذور ہیں۔

ڈاکٹر کریم ڈرافس مین علی کاظم اور اس پیارے سے شگری لڑکے عمران کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ مجھے پاک فضائیہ لاہور بیس کے ان افسروں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جو بیس کے بلتی لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرے گھر بھیجتے تھے۔

میں اپنی دوست مریم، اس کے بھائی محمد ارشاد شاہ اور اس کے دوست کے خلوص کی شکرگزار ہوں۔ جنہوں نے وائرلیس کے رابطے کے ذریعے مجھے میرے بچوں کی عافیت سے مطلع رکھا۔

سلمٰی اعوان



سچ تو یہ تھا کہ بن باس لینے والی بات ہو گئی تھی، رام چندر جی کی طرح۔ پر دکن کے ڈونڈوک بن میں نہیں، بلتستان کی حسین اور جنت نظیر وادیوں میں۔ چندر جی کو ایک رانی کیکئی کا سامنا تھا پر یہاں تو بہت سی رانیاں اور راجے تھے۔ جن کی آنکھوں میں وہ ہمہ وقت ایک نوکیلے کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔ یوں اس کے اندر کا دکھ بھی پھنکارے مارتا رہتا تھا۔ اس کی انا بھی من راجہ دسترتھ کو قائل کرتی رہتی تھی کہ گوشت پوست کا اس کا یہ وجود بن باس ہی ہو جائے، تو بہت اچھا ہے۔

اس وقت بھی بات تو چھوٹی سی تھی، پر آنا فانا بڑی بن گئی تھی۔ وقت کا وہ لمحہ تو ظالم تھا پر پس منظر ظالم ترین تھا۔

اس نے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھولی تھیں۔ نیچے لان کی کیاریوں میں اُگی رات کی رانی کی بوجھل اور مسحور کن خوشبو ہوا سے اٹکھیلیاں کرتی اس کے نتھنوں سے آ ٹکرائی۔ جون کی رات کے اس پہر کی فضا بہت گرم تھی۔ کمرہ دن میں ائر کنڈیشنڈ چلتے رہنے کی وجہ سے ابھی تک ٹھنڈا تھا۔

پھر سٹیوی ونڈرز کی دل کش آواز ''آئی جسٹ کال ٹو سے آئی لو یو'' اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے سر دیوار سے ٹیک کر آنکھیں ابھی بند کی ہی تھیں کہ گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز پر فوراً کھول ڈالیں۔ نیچے گاڑی میں اس کا دیور اور دیورانی بیٹھے گیٹ سے نکل رہے تھے۔ اس کے مرحوم شوہر کی گاڑی پر اس کے دیور، جیٹھ کس ڈھٹائی سے قابض ہو گئے تھے۔ وہ

تو بس تصویر حیرت بنی یہ سب دیکھتی تھی اور جلتی کڑھتی تھی۔

تبھی وہ دہلیز میں آ کھڑا ہوا تھا۔ پینتالیس انچ چوڑی چھاتی والا اس کا جیٹھ ایک پٹ والے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا یوں جیسے زمین میں بجلی کا کھمبا گڑا ہو۔

بخدا اس نے نہیں دیکھا تھا کہ اس کا گندم کے پکے خوشے جیسا رنگ، دہکتے کوئلوں جیسا ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی کی دو مستقل لکیریں پانچ میں بدلی ہوئی تھیں۔ اس کی ناک کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ چار سال ایک گھر میں رہنے سے اتنا تو وہ جانتی تھی کہ یہ پھڑ پھڑاہٹ ہمیشہ اضطرابی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی تھی۔ پر وہ تو اس وقت جلن اور حسد کے کھولتے کڑاہے میں پاؤں ڈالے بیٹھی تھی۔ ''آئی جسٹ کال ٹو سے آئی لو یو'' جیسا گیت بھی اپنی رعنائی کھو بیٹھا تھا۔

اب ایسے میں اس کا چہرہ دیکھ کر صورت حال کو جان لینا بہت مشکل کام تھا۔

اور اس نے کہا:

''تمہیں منع کیا گیا تھا کہ لان کی غربی دیوار پر کپڑے نہیں پھیلانے اور تم نے پھر پھیلائے۔''

وہ تلملا اُٹھی ''کمال ہے یہ نادر شاہی حکم صرف میرے لیے کیوں؟ سب وہاں پھیلاتے ہیں۔''

''میں صرف تمہاری بات کرتا ہوں۔''

''کیوں؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے خوفناک حد تک پھٹ گئی تھیں۔

''ابا جان کپڑوں کی وجہ سے شام کو وہاں بیٹھ نہیں سکتے۔''

وہ اب غصے کے کھولتے کڑاہے میں پوری طرح گر گئی تھی۔ عین اس کی ناک کی سیدھ میں آ کر کھڑی ہوئی اور بولی۔

''تمہارا تو وہ حال ہے کہ آتا گوندھتے میں ہلتی کیوں ہو۔ بھئی میرا وجود تمہاری برداشت سے باہر ہے۔ سیدھی طرح کہو کہ گھر چھوڑ دو اور کہیں چلی جاؤ۔ اُلٹے سیدھے

اعتراضات سے پریشان کرنے کا فائدہ؟ مشترکہ گھر میں بات فرد کی نہیں افراد کی ہوتی ہے۔ حکم اجتماعی طور پر دو، انفرادی حیثیت میں، میں اسے نہیں مانتی۔"

زنائے کا ایک تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ "زبیر غریب ٹھیک واویلا کرتا تھا۔ اس کمبخت ایم۔اے پاس نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ ہمہ وقت دلائل، ہمہ وقت تاویلات، تمہاری اسی چخ چخ نے اسے قبر میں اُتار دیا ہے۔"

داہنا گال داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کے سائے میں آ گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اور دید کا یہ انداز اس مجروح شیر کی مانند تھا جو اچانک کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بن جائے اور کچھ یوں ناکارہ ہو جائے کہ محض آنکھوں سے ہی غیظ و غضب کے شعلے برسانے پر اکتفا کرے۔

"زبیر تو قبر میں اُتر گیا ہے۔ پر تم تو سلامت پھرتے ہو۔"

"ہاں ہاں اب ہم پر تمہاری نظریں ہیں۔ تم خدا سے چاہتی ہو کہ گھر خالی ہو اور تم جائیداد کی مالک بنو۔"

"لعنت ایسی جائیداد پر جو انسان سے انسانیت چھین لے اور اس کی آنکھوں پر حرص کی پٹیاں باندھ دے۔"

"بکواس بند کرو۔" اس کی آواز میں جنگلی جانور جیسی غراہٹ تھی۔ "ابھی جاؤ اور سب کپڑے اُتار کر لاؤ۔"

"نہیں جاؤں گی۔ سب کو بلاؤ اور سب سے کہو۔"

اور پھر کورو کیشتر کے میدان میں گھمسان کا رن پڑا۔ اس نے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی اپنی سی سعی تو کی پر ناکام رہی۔ پانڈو شہزادے نے اس کی گردن اپنے آہنی ہاتھ میں دبوچ کر، اسے دھکا دیا اور بولا۔

"نکل جاؤ ابھی اور اسی وقت۔ ایسی اکڑ اور خود سری ہمیں نہیں قبول۔ اس کی زندگی جہنم بن گئی تھی اور اب ہماری بن رہی ہے۔"

وہ ریس میں حصہ لینے والے گھوڑے کی طرح ہانپتی تھی اور اسے خونخوار آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ جب وہ پھر گرجا۔

''تم نے سنا نہیں، گھر خالی کر دو چار سال سے تم جیسی بانجھ عورت کو برداشت کر رہے ہیں۔ مقابلے کرتی ہے دیورانیوں کے جو بعد میں بیاہ کر تین تین بچوں کی مائیں بن گئی ہیں۔''

اس نے بیگ اُٹھایا۔ بغل میں دبایا۔ چادر اوڑھی اور گھر سے نکل آئی۔

اس نے ایک بار پلٹ کر اس گھر کو نہیں دیکھا جس کے چپے چپے کو اس نے جی جان سے سنوارا تھا، سجایا تھا۔ گزشتہ ایک سال سے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ گھر اس کا عارضی ٹھکانا ہے۔ وہ کسی وقت بھی یہاں سے نکالی جا سکتی ہے۔

زمین کے سینے کو اس کے اشتعال بھرے پاؤں کوٹتے رہے۔ وہ چلتی رہی۔ بلا مقصد گلیوں کے موڑ کاٹتی رہی۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔

پھر جیسے اس کے اندر کا دُکھ بے چارگی کی پھوار میں بھیگ گیا۔ وہ نڈھال سی ایک نیم تاریک ویران سی گلی کے ایک ویران سے مکان کے ایک ٹوٹے پھوٹے تھڑے پر بیٹھ گئی۔ آنسو پرنالے کی صورت اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

بڑی لاڈلی بیٹی تھی اپنی ماں کی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، پڑھنے لکھنے میں ذہین، شکل و صورت میں حسین ماں نے اونچے گھر میں بیاہا۔ بہت خوب صورت لڑکے کو داماد بنایا۔ لوگوں نے بھی اس جوڑی کو رشک سے دیکھا۔

زبیر کے گھر آ کر اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ عجیب سی عادتوں کا مالک ہے۔ ایک تو وہ شکی مزاج تھا دوسرے اپنی بڑی بھاوج کا کہنے کار تھا۔ شادی کے تھوڑے دنوں بعد پہلا نزلہ تو اس کی ملازمت پر گرا۔ اس کی جیٹھانی کو اس کا بن سنور کر کالج جانا سخت ناپسند تھا۔ زبیر نے جب ملازمت چھوڑنے کی بات کی تو وہ بولی۔

''ارے مفت کا پیسہ آتا کیا بُرا لگتا ہے۔ دس بجے جاتی ہوں اور ایک بجے واپس

آ جاتی ہوں۔''

زبیر نے بالوں میں تیزی سے کنگھا چلاتے ہوئے کہا۔

''میں مفت خورا نہیں۔ گھر میں بیٹھو اور گھرداری سیکھو۔ تمہیں تو روٹی بنانی نہیں آتی۔''

اس نے حالات کا جائزہ لے کر نوکری چھوڑ دی۔ نہ چھوڑتی تو گھریلو حالات کے بگڑنے کا ڈر تھا۔ پر جب پہلی بار ان کے درمیان کسی چھوٹی سی بات پر تُو تکار کی صورت حال پیدا ہوئی تو وہ گنگ سی رہ گئی۔

ایسا پڑھا لکھا وجیہہ ذمہ دار افسر جو بڑا کلچرڈ اور مہذب نظر آتا تھا، فوراً ہی گالی گلوچ پر اُتر آیا اور پھر گھر سے نکل جانے کا بھی کہنے لگا۔

زخمی کوڑیالے ناگ کی مانند وہ تڑپ کر بولی۔ ''کیوں نکل جاؤں۔ کوئی بھاگ کر آئی ہوں۔ ڈیڑھ فٹ اونچے لہراتے شملوں اور پگوں والے لائے تھے مجھے اکٹھا کر دانہیں پہلے، پھر ایک بار ہی نکلوں گی۔''

اور جب اُس نے اپنی ماں سے اس دُکھ کا اظہار کیا۔ انہوں نے اس کے شانے پر محبت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بچی! میاں بیوی کسی غریب کاشتکار کی بیلوں کی اس جوڑی کی طرح ہیں۔ جو اکٹھے زمین کا سینہ چیرتے ہیں۔ اکٹھے سہاگہ اور گراہی کا عمل سرانجام دیتے ہیں۔ لڑتے مرتے بھی ہیں اور پھر ایک ہی کھرلی پر پٹھے (چارہ) کھانا بھی اُن کا مقدر ہے۔''

سو جب لڑنے مرنے کے عمل سے فارغ ہو کر انہوں نے کھرلی میں اکٹھے پٹھے کھانے شروع کئے تو اس نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''زبیر تم کیا عورت کو کرائے دار سمجھتے ہو کہ جب چاہا اسے نکال دیا، یا تمہاری نظروں میں وہ پاؤں کی جوتی ہے کہ جسے جس وقت چاہا اُتار پھینکا۔ دو برتنوں کا ایک جگہ رہنے سے ٹکراؤ تو ضروری ہے۔ لڑائی کرو، پر یہ کیا کہ گھر سے نکالنے کے درپے ہو۔''

اور اس نے اسے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے گھنے سیاہ بالوں پر پیار کیا اور تاسف

بھرے لہجے میں بولا ''یار! معاف کر دو۔ پر خدا کے لیے یہ بھی یاد رکھا کرو کہ میں ہسٹری میں ایم۔اے پاس سے بیاہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پر مقدر زور آور تھا۔ مجھے ''گیلڈ سٹون'' کی خارجہ پالیسی پر لیکچر سننے سے ڈر لگتا تھا اور تم مجھے وہ لیکچر پلاتی ہو۔ خدا کے لیے لیکچر نہ پلایا کرو۔''

پر دوسری بار جب ایسی ہی صورت حال نے جنم لیا، تب بھی بعد میں وہ بہت چیخی۔

''تم آخر مجھے گھر سے نکل جانے کا کیوں کہتے ہو؟ تمہاری یہ بات مجھے ہوا میں معلق کر دیتی ہے۔''

وہ بولا: ''دیکھو مشرق کا مرد کتنا بھی ایڈوانس کیوں نہ ہو، عورت کی زبان درازی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم نے میرے غصے کو اپنی زبان سے مشتعل کیا۔''

''تم شاید مجھے پتھر کی طرح دیکھنا چاہتے ہو، جو ممکن نہیں۔ میں گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا انسان ہوں جسے ناجائز اور غلط بات پر احتجاج کا پورا حق حاصل ہے۔''

گھر کی سیاست سے وہ بہت دیر میں شناسا ہوئی تھی۔ بڑی بھابھی کا ذہن کتنا پراگندہ تھا۔ اس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر جب زبیر ان کے سکھانے پر بولتا تو گھر کا سکون درہم برہم ہو جاتا۔ وہ اپنی ماں سے جب جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی تو وہ متانت سے کہتیں۔

''صبر میری بچی! اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

صبر کا یہ درس دینے والی اچانک شہر خموشاں کی شہری بن گئی۔ چھ ماہ بعد ابا بھی اکتا کر ان کے پاس جا سوئے۔ دونوں کے اس جہان سے جانے کی دیر تھی۔ اس کی بڑی بھابھی نے وہ پر پرزے نکالے کہ وہ دنگ رہ گئی۔ اس کی جیٹھانی سے مل کر اس کے بارے میں ایسی خوفناک باتیں کہیں کہ جب اس نے سنیں تو سینہ کوٹ لیا۔

زبیر نے جس سرد مہری اور بے حسی کا مظاہرہ کیا اس نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔

اس وقت اس کے بیاہ کو چار سال بیت گئے تھے اور اس کی گودی ہنوز خالی تھی۔

اور پھر زبیر کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔

چار سال کے عرصے میں اس نے سبھی مزے چکھ لیے تھے۔ زبیر جیسا بھی تھا، زندگی کا ساتھی تھا۔ پر اس ساتھی نے اس کے پر کاٹ کر پنجرے میں بند کر دیا تھا۔ اس کی انشورنس، پروویڈنٹ فنڈ اور گریجوایٹی سب اس کے والد کے نام تھیں۔ کسی نے اس سے یہ تک پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس کے پاس کچھ ہے یا نہیں۔

اور آج اس کی عدت کو پورا ہوئے صرف دو دن اوپر ہوئے تھے۔

ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ خدا جانے عدت تک کیسے صبر کیا۔

اب وہ اس ویران سی گلی کے ویران سے تھڑے پر بیٹھی چھم چھم روتی تھی اور اپنے آپ سے پوچھتی تھی کہ کہاں جائے۔

اور یہ "کہاں" ایک ایسا اندھیرا غار تھا جو منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

بڑا بھائی اپنے بیوی بچوں کا تھا۔ کبھی اس کے گھر جھانکا تک نہیں تھا۔ کبھی پوچھا نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہے چھوٹا دو سال سے کینیڈا میں تھا۔ اسے وہ کیا لکھتی۔ بقیہ رشتہ داروں اور عزیزوں کے اطوار بھی سامنے تھے۔

تب اس نے آنسوؤں کا سارا پانی اپنے حلق میں اُتار لیا تھا۔ وہ کھڑی ہوئی خط مستقیم کی طرح اور اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"دکھ کی یہ صلیب میں تنہا اپنے کندھوں پر اُٹھا کر چلوں گی۔ ہونٹوں پر ٹانکے لگا لوں گی اور جی داروں کی طرح جیوں گی۔"

اور پھر زبیر کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔

چار سال کے عرصے میں اس نے سبھی مزے چکھ لیے تھے۔ زبیر جیسا بھی تھا، زندگی کا ساتھی تھا۔ پر اس ساتھی نے اس کے پر کاٹ کر پنجرے میں بند کر دیا تھا۔ اس کی انشورنس، پروویڈنٹ فنڈ اور گریجوایٹی سب اس کے والد کے نام تھیں۔ کسی نے اس سے یہ تک پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس کے پاس کچھ ہے یا نہیں۔

اور آج اس کی عدت کو پورا ہوئے صرف دو دن اوپر ہوئے تھے۔

ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ خدا جانے عدت تک کیسے صبر کیا۔

اب وہ اس ویران سی گلی کے ویران سے تھڑے پر بیٹھی چھم چھم روتی تھی اور اپنے آپ سے پوچھتی تھی کہ کہاں جائے۔

اور یہ "کہاں" ایک ایسا اندھیرا غار تھا جو منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

بڑا بھائی اپنے بیوی بچوں کا تھا۔ کبھی اس کے گھر جھانکا تک نہیں تھا۔ کبھی پوچھا نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہے چھوٹا دو سال سے کینیڈا میں تھا۔ اسے وہ کیا لکھتی۔ بقیہ رشتہ داروں اور عزیزوں کے اطوار بھی سامنے تھے۔

تب اس نے آنسوؤں کا سارا پانی اپنے حلق میں اُتار لیا تھا۔ وہ کھڑی ہوئی خط مستقیم کی طرح اور اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"دکھ کی یہ صلیب میں تنہا اپنے کندھوں پر اُٹھا کر چلوں گی۔ ہونٹوں پر ٹانکے لگالوں گی اور جی داروں کی طرح جیوں گی۔"

مصروف تھی۔ روح اللہ اسے ایسے ہی یاد آ یا تھا جیسے گھپ اندھیرے میں بجلی چمک جائے وہ اس کے بھائی کا دوست تھا۔ انجینئرنگ کالج میں اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ پہلی بار جب اس کے ساتھ ان کے گھر آیا تو یہ جاننے پر کہ سکردو سے ہے، اماں نے اس کا سینہ اور ماتھا چوما تھا۔ اماں کا مرحوم بڑا بھائی دس سال سکردو میں رہا تھا اور اماں سکردو کے پھلوں اور سوغاتوں کی نمک خوار تھی۔ روح اللہ نے ایک بار اس سے بھی کہا۔

''کبھی آیئے نا وہاں۔ بلتستان کی وادیاں فطرت کی شاہکار، اس کے نظارے روح پرور وہاں کے لوگ محنتی، جفاکش، مخلص اور پاکستان سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے اور وہ علاقہ وسیع تہذیبی ورثے کا مالک۔''

اور اس نے مدھم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر کہا ''اپنا وطن ہے، کبھی انسان آ ہی جاتا ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''اپنا وطن ارے! کہاں جانتے ہیں لوگ وطن کے ان حصوں کے بارے میں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے میرے ساتھی لڑکے یورپ کی خوب صورت جگہوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا باہر کی بات کرتے ہو۔ اپنی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔ خپلو اور شگر خوب صورت ترین وادیاں جنہیں بیرونی سیاحوں نے اس دنیا پر جنت کہا ہے۔''

چند ایک بولے۔

''یہ کہاں ہیں؟''

اور روح اللہ ایک بار پھر ہنسا۔

''یقیناً آپ کو بھی نہیں پتہ ہوگا۔''

اس نے خجالت تو محسوس کی پر حقیقت کا صاف گوئی سے اعتراف بھی کیا۔

''واقعی روح اللہ! ہم کیسے پاکستانی ہیں۔ پاکستان کا ہر چوتھا لکھاری انگلینڈ، امریکہ یاترا کی داستانیں قلم بند کرتا ہے، پر یہ کیسا ستم ہے کہ انہیں یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ملک کے

گوشہ ہائے دور دراز کے چہروں پر پڑی نقاب سرکا کران کے رُخ روشن بھی عام لوگوں کو دکھا سکیں۔''

اور اب وہ بیٹھی سوچتی تھی کہ وہ کے۔ ٹو، ماشہ بردم، رکشہ بردم اور براڈ پیک کی چوٹیوں کو سر کرنے جا رہی ہے یا انہیں زیر کرنا چاہتی ہے۔ جنہوں نے اس کی محبت اور خلوص کو مٹی میں روند دیا ہے۔ پچھ نہیں ہوا، مشیت کی مرضی، اس کا کیا دوش۔

اس وقت دُکھ اور جلن کی ایک ایسی آگ اس کے اندر بھڑکی ہوئی تھی۔ جس نے اسے بے کل کر رکھا تھا۔

اور پھر جب کافی بھیڑ چھٹ چھٹا گئی تب اسے بلایا گیا۔ خصوصی رعایت کرتے ہوئے اسے بلڈنگ کے دوسرے حصے سے اوپن ٹکٹ لانے کو کہا گیا اور جب وہ اس سارے عمل سے فارغ ہوئی، اس کے ہاتھ میں فوکر طیارے کی جو اگلی صبح چھ بج کر پچپن منٹ پر پرواز کر رہا تھا، ٹکٹ تھما دی گئی۔

دوپہر اور شام کا بیشتر حصہ بازار میں کٹا۔ کلائی کی چھ طلائی چوڑیاں بیچیں اور اہم چیزوں کی خریداری کی۔ رات اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر گزاری۔ ایئرپورٹ صبح کے ملگجے اندھیرے میں پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ چیکنگ وغیرہ کے سب مراحل سے فارغ ہو کر وہ اب وسیع و عریض انتظار گاہ میں بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے تین دیوہیکل جرمن زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ دائیں طرف ایک نیا نویلا جوڑا آ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے نہایت خوبصورت سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔ کٹے بالوں کے درمیان مُنّے مُنّے نقوش والا چہرہ چمبیلی کے پھول کی طرح ہنستا تھا۔ سرخ جوڑا اور بازو سے بازو جوڑے بیٹھا ایک دل کش مرد۔ اس نے دانت ہونٹوں میں گاڑ دیئے اور آنکھوں کا رُخ پھیر لیا۔ بائیں طرف ایک عورت ڈیڑھ دو سالہ بچے کو گود میں اُٹھائے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دانت ہونٹوں میں مزید گہرے چلے گئے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی۔ آنکھوں کے عین سامنے ''نماز کے لیے جگہ'' لکھا ہوا تھا۔ بیگ کو

کندھے سے لٹکایا اور تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔

اور جب اس نے سجدے میں سر جھکایا، اسے احساس ہوا تھا جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کا نہیں، خون کا فوارہ اُبل پڑا ہو۔

سکردو کی پہلی پرواز کی تختی اُبھری اور اناؤنسر نے اعلان کیا۔ لوگ انتظار گاہ کے سامنے کھڑی گاڑی میں سوار ہونے لگے۔

ایک نوعمر، خوش شکل سالڑکا اپنی ہی عمر کے ایک غیر ملکی لڑکے کے ساتھ ٹہلتا ٹہلتا اس کے سامنے آ کر رُک گیا۔

''دُعا کرو فریڈرک آج نارمل روٹ کی پرواز نہ ہو۔ انڈس ویلی کے روٹ کا تھرل..... مائی گاڈ'' اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ ''دنیا کا خوبصورت اور خطرناک ترین روٹ۔''

آدھ گھنٹہ بعد فوکر طیارے کی دوسری پرواز کے لیے وہ بھی باہر آ گئی۔ خوش شکل سٹیورڈ نے بورڈنگ کارڈ پر سے سیٹ نمبر دیکھ کر اسے بٹھایا۔ چھوٹا سا فوکر، بے چارہ بوئنگ جیسی شان وشوکت سے محروم، دروازے بند ہو گئے تھے۔ دو منٹ، تین، چار، پانچ اور پھر دس منٹ تب اعلان ہوا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے پہلا طیارہ ابھی راستے میں ہی ہے۔ بیس منٹ بعد بتایا گیا کہ جہاز فی الحال پرواز سے قاصر ہے۔ مسافر ایک ایک کر کے اُٹھے، باہر نکلے اور ایک بار پھر اسی ہال میں آ کر بیٹھ گئے۔ پہلے طیارے کے مسافر بھی ہنستے مسکراتے واپس آ گئے تھے۔ پتہ چلا کہ کاغان ناران تک تو خیریت تھی پر جگلوٹ پر اتنی دھند تھی کہ جہاز کے آگے بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ معاملہ اگلے دن پر ملتوی ہو گیا تھا۔

اب پھر پی۔ آئی۔ اے کے ناردرن ایریا کا دفتر تھا، وہ تھی اور لوگوں کا جم غفیر، ٹکٹ پر اگلے دن کی تاریخ پڑی اور اس نے پوچھا۔

''کیا کل بھی ایسا ہی ہو گا؟''

اور وہ منگولی خدوخال والا نوجوان مسکرایا۔ ''گھبرائیے نہیں، کل بوئنگ کی باری ہے۔ وہ زیادہ بلندی پر پرواز کرسکتا ہے۔ کل آپ انشاءاللہ سکردو کا پانی ضرور پئیں گی۔''

پی۔آئی۔اے نے بلتستان کے لوگوں کے لیے ہوٹل والوں سے ٹھیکہ کر رکھا ہے۔ پروازوں کی معطلی کے سلسلے میں انہیں وہاں ٹھہرایا جاتا ہے۔ جب اس نے کاؤنٹر کلرک سے بات کی تو وہ بولا۔

''یہ رعایت صرف غریب مقامی لوگوں کے لیے ہے۔''

''میں کیا آپ کو امیر نظر آتی ہوں؟''

اس نے اسے مسکرا کر یوں دیکھا جیسے کہتا ہو۔ میرے خیال میں تو آپ اونچی شے ہیں۔ ''دراصل'' وہ پھر بولا ''ان علاقوں کی ترقی وخوشحالی کے لیے کرائے کی شرح بہت کم رکھی گئی ہے۔ ان کی رہائش کا انتظام پروازوں کی معطلی کے سلسلے میں پی۔آئی۔اے کی ذمہ داری ہے۔ ایک کمرے میں چار افراد ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اب آپ بتائیے میں آپ کو کہاں ایڈجسٹ کروں۔ ایک کمرہ ایک فرد کو الاٹ نہیں کیا جاسکتا؟''

''کچھ کیجئے۔ رات میں نے ایئرپورٹ پر گزاری ہے۔ ایک پل آنکھ نہیں جھپک سکی۔''

پھر اسے ایک فارم دیا گیا اور بتایا گیا کہ کھانا اسے اپنی گرہ سے کھانا پڑے گا چھ بجے پرواز ہے۔ گاڑی آپ کو یہیں سے پک کرلے گی۔''

اور شمع ہوٹل کے کمرے میں اس نے اپنے آپ کو بیڈ پر گرا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر سُو اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔

جہاز نے اونچی اڑان لے لی تھی۔ قد آور درخت بوٹے بن گئے تھے۔ مارگلہ کی پہاڑیاں مٹی کی ڈھیریاں لگ رہی تھیں۔ اسلام آباد کے گھر گڑیوں کے گھروندوں میں منتقل ہوئے کھیت جیومیٹری کے ڈیزائن لگنے لگے۔ ایبٹ آباد کی سرسبز پہاڑیاں اور ان کے دامنوں

میں بنے ٹین کی چھتوں والے گھر سورج کی اولین روشنی میں یوں چمکتے تھے جیسے کسی نے سبزے پر جستی چادر کے چھوٹے چھوٹے ڈبے یہاں وہاں لڑھکا دیئے ہوں۔ کہیں کہیں یہ بچوں کی کھلونے گاڑیاں سی دکھائی دیتیں۔ مانسہرہ، کاغان، ناران جھیل سیف الملوک۔

اس کی ناک شیشے کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ بوئنگ کی پرواز اس درجہ آرام دہ کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انسان فضا میں معلق ہو گیا ہو۔ بادل جیسے کھیتوں کے کھیت اگے ہوئے، کہیں برف کے گالوں کا روپ دھارا ہوا، کہیں یوں بکھرے ہوئے جیسے کسان نے اپنے کشادہ آنگن میں روئی دھنک کر ڈال دی ہو۔

اب سرسبز و شاداب پہاڑوں کی جگہ سیاہ ننگی چٹانیں اُبھر آئی تھیں۔ دامنوں میں برف کی چاندی سمیٹے کہیں کہیں چاندی ندی نالوں کی صورت میں بہتی نظر آتی تھی۔

معاون پائلٹ نانگا پربت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ نانگا پربت کے پہاڑ سر سے پاؤں تک برف کا پیرہن پہنے اس طمطراق سے بیٹھے تھے جیسے جنگل کا بادشاہ اپنے حالی موالیوں کے سامنے بیٹھا ہو۔ ایک جگہ بادلوں کی صورت گری کچھ ایسی تھی کہ جیسے کوئی محبوبہ دلنواز، عاشق صادق سے کہتی ہو۔ ''کر چھتری دی چھاں میں چھاویں بہنی آں۔''

آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز جاری تھی۔ جب اس نے سنا ہم شگر کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ پروں نے حرکت کی تھی۔ نیچے دریائے سندھ ایک چھوٹی سی ندی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دائیں بائیں پر ہیبت سیاہ پہاڑ، نیچے دریائے سندھ کی ریت تجریدی آرٹ کے ایسے نادر شاہکار کہ وہ بس دیکھا کئے۔

بس تو جیسے انسان آنکھ جھپک لے۔ سکردو کے بلند و بالا درخت نمایاں ہو گئے۔

صرف ایک گھنٹہ پانچ منٹ میں وہ ایک ایسی جگہ کھڑی تھی جو ننگے بچے پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ جہاں سورج کی چڑھتی جوانی دلآویز تھی۔ سرمئی سڑکیں اور لان چمکتے تھے۔ سامنے کریم رنگی چھوٹی سی عمارت خوش آمدید کہنے کو بے تاب تھی۔ بائیں طرف نادر کسی حسین

البیلی نار کی مانند لشکارے مار رہا تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ شاہ بلوط جھومتے تھے اور ٹاور سے ذرا پیچھے شنگریلا ریسٹورنٹ چائے کے لیے بلا رہا تھا۔

"میں نے اب تک کی زندگی میں کیوں، کب، کہاں اور کیسے کی اہمیت کو نہیں سمجھا تھا۔ پر آج سمجھی ہوں اور یہ جان پائی ہوں کہ انسان ان ڈرامائی موڑوں کو جو اچانک سامنے آ جاتے ہیں۔ ان چاروں سوالیہ علامتوں کے ساتھ کیوں نتھی نہیں کر پاتا ہے۔"

پھر جب وہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے کے حسن کو جی بھر کر دیکھ چکی تب وہ کریم رنگی عمارت میں داخل ہوئی اور باہر نکلی۔ یہاں سوزکیوں اور ویگنوں والے کھڑے تھے۔ جو سکردو شہر کے لیے سواریاں بٹھا رہے تھے۔

سامنے شنگریلا ریسٹورنٹ کے شیشوں والے دروازے اور کھڑکیاں ایک کپ چائے کے لیے اسے شدومد سے بلانے لگے تھے۔ اسے کون سی جلدی تھی۔ وقت وافر، جگہ اجنبی اور منزل لاپتہ۔ لہٰذا وہاں بیٹھنے اور ایک کپ چائے پینے میں کیا حرج تھا۔

زہر مہرہ کے کپ میں گھونٹ گھونٹ چائے پی۔ دروازے کھڑکیوں کے شیشوں کو پھاڑتی سورج کی آتشیں کرنیں اب اس کا چہرہ جلانے لگی تھیں۔ اُٹھنے میں عافیت تھی۔

روح اللہ کے بارے میں اس نے سول سیکورٹی کے دولڑکوں سے پوچھا۔ ان کے چہروں پر لاعلمی کے اثرات تھے۔ کسی نے کہا "بڑے صاحب سے پوچھئے۔"

اور وہ بڑے صاحب کے حضور پہنچ گئی۔ یہ بڑا صاحب حاتم خان تھا۔ سچ مچ کا حاتم خان جس نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی مشکل کو سمجھا اور فی الفور سکردو میں جگہ جگہ ٹیلی فون کھڑکا دیئے، اور بالآخر جب وہ روح اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ تب دھیرے سے سر اُٹھایا۔ دھیمی سی مسکراہٹ چہرے پر لایا اور دھیرج سے بولا۔

لیجئے آپ کے میزبان پہنچ رہے ہیں۔



جیپ سکردو ایئرپورٹ روڈ پر تیزی سے بھاگی جاتی تھی۔ روح اللہ کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتا مسکراتا اور کہتا۔

''تو پھر آپ آ ہی گئیں بلتستان۔ پر میں حیران ہوں آپ اکیلی کیسے چلی آ ئیں؟''

اس نے چہرہ باہر کیا۔ روح اللہ کو شاید ابھی تک اس کے وجود کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

ریت کے لمبے چوڑے میدان شروع ہو گئے تھے۔ عناب کے دورویہ درخت پیچھے رہ گئے تھے۔ اوائل بہار میں یہ درخت بہت مسحور کن خوشبو فضا میں بکھیرتے ہیں گمبہ سکردو اور امام باڑہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ جب اس نے اپنا رُخ اندر کیا اور بولی۔

''ارے میرا وطن ہے یہ روح اللہ! مجھے تو یہاں آنا ہی تھا۔ رہی بات تنہا آنے کی۔ بتاؤ تم لوگ نہیں ہو کیا یہاں۔ بھلا شبیر اور تم میں کوئی فرق ہے۔''

وہ ہنسی تھی اور ہنسی میں اس کی ذات سے متعلق سب کچھ چھپ گیا تھا۔ تبھی روح اللہ کسی کامیاب داستان گو کی طرح شروع ہوا۔

بلتستان کو چینی لوگوں نے بلور، لداخیوں نے اسے بلتی یل یا سری بتان (خوبانیوں کی سرزمین) خلیجی ممالک نے اسے تبت خورد اور یہاں کے باشندوں کو تبتی کہا ہے۔ ایرانی مُبَلّـخین کی اس علاقہ میں آمد کے بعد، اس کا نام تبتی زبان کے لفظ ''بلتی'' اور فارسی کے لفظ ''ستان'' سے بلتستان بنا اور یہی اس کا آج کا نام ہے۔

ریت کا میدان ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ہوا گرم تھی۔ روح اللہ نے ساری گرم ہوا

اپنے چہرے پر لپیٹنے کی کوشش کی اور پھر بولا۔

گیارہویں صدی عیسوی میں یوں ہوا کہ رینگو گلیشر اپنی جگہ سے ذرا سا سرک گیا تھا دریائے شیوق میں زبردست طغیانی آئی۔ اس کی تباہ کاریوں نے اس عظیم سلطنت بلور کو تباہ کر دیا۔ سینکڑوں دیہات نیست و نابود ہو گئے۔ لاکھوں انسان اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس سیلاب نے اپنے راہ میں آنے والی ہر وادی کو کاٹ کر گہری اور ریتلی وادیوں میں بدل دیا۔ اس طوفان کا زیادہ نشانہ سلطنت بلور کا دارالحکومت جو مقامی روایات کے مطابق ''رگیایل'' (بڑی اور بادشاہ کی جگہ) کہلاتا تھا، برسوں ایک ریتلے اور پتھریلے میدان کی صورت میں پڑا رہا۔ جس کی وجہ سے تبتی لوگوں نے اسے سکرم دو یعنی خشک اور ویران جگہ کا نام دیا۔ سکرم دو بعد میں کثرت استعمال سے سکردو بن گیا۔

جیپ کی رفتار بڑی سُست تھی۔ کہیں کہیں ننگے بُچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف یوں چمکتی تھی جیسے کسی کالے کلوٹے چہرے پر برص کے دھبے۔

شگری کلاں گزرا۔ جیپ اس نے دائیں جانب موڑلی۔ نصف کلومیٹر پر شگری بالا تھا۔

پھر جیپ ایک جگہ رُک گئی۔ روح اللہ باہر آ گیا۔ وہ بھی اُتر آئی۔

باہر دھوپ تیز ضرور تھی۔ پر ہوا کی تیزی تپش کو محسوس نہیں ہونے دیتی تھی۔

یہ جگہ شگری بالا تھی۔ سامنے ایک بڑے سے ٹیلے پر زمانہ قدیم کے رہائشی محل کے آثار پائے جاتے تھے۔ روح اللہ نے ایک پتھر کے پاس جا کر کہا۔

''اسے دیکھئے ہم اسے اپنی بلتی زبان میں بردوسنساس (چکی کے پاٹ کا سرہانہ) کہتے ہیں۔ یہ پتھر آج بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت داستان وابستہ ہے۔''

اب وہ ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے عینک اُتار دی تھی اور ابھی یہ الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکلے ہی تھے کہ ''ہاں تو جب یہ وادی سکردو۔''

جب اس نے جو اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی، اس کی بات کاٹ دی۔

''روح اللہ! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تاریخ کا یہ عظیم سرمایہ مجھے اتنی جلدی جلدی نگلوانے کی کوشش مت کرو۔ میں اسے ہضم نہ کر پاؤں گی، اور مجھے بدہضمی ہو جائے گی۔ میں کوئی دنوں کے لیے تھوڑی آئی ہوں۔ مہینوں رہوں گی۔ چپہ چپہ کونا کونا چھانوں گی۔ وادی وادی گھوموں گی۔ چلو اُٹھو مجھے گھر لے چلو۔ بیوی بچوں سے ملاؤ اور جب شام ڈھلے گی تو یہاں آئیں گے اور پھر اسی ٹیلے پر بیٹھ کر میں تم سے یہ تاریخی داستان سنوں گی۔''

روح اللہ شرمندہ سا ہو گیا۔ معذرت کرتے ہوئے بولا: ''دراصل میں بھی عجیب سر پھرا آدمی ہوں۔''

اس کا چہرہ ابھی بھی ویسا ہی معصوم تھا۔ اس کا جسم ابھی بھی زمانہ طالب علمی جیسا دبلا پتلا تھا۔ اس نے عینک آنکھوں پر چڑھائی اور جیپ کی طرف بڑھا۔

اب پھر سکردو ایئرپورٹ روڈ پہیوں کے نیچے تھی۔ ویران سڑک مقپون پل یعنی ہرگیسہ نالہ آیا اس میں سدپارہ جھیل کا پانی رواں دواں تھا۔

سکردو ڈگری کالج کے ساتھ ہی سکردو بازار شروع ہوتا ہے۔ دوکانوں کے اندر بیٹھے باریش مرد۔ دوکانوں سے باہر باتیں کرتے لوگ۔ چلتے پھرتے بچے غیر ملکی سیاحوں کی ٹولیں بازار میں ایک بھی عورت نظر نہیں پڑتی تھی اور جب جیپ یادگارِ شہداء کے پاس سے گزرنے لگی اس نے کہا۔

''روح اللہ رُکو ذرا۔ میں فاتحہ پڑھنا چاہتی ہوں۔''

وہ اُتری۔ اُن شہداء کی یادگار جنہوں نے بلتستان کو پاکستان میں مدغم کرنے کے لیے آزادی کی جنگ لڑی اور شہید ہوئے۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

پھر چشمہ بازار گزر گیا۔ سکمیدان کی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے وہ اب سٹیلائٹ ٹاؤن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خوبانی کے درخت پھلوں سے بوجھل تھے۔ پر پھل ابھی کچا تھا۔

توت بھی کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ دراصل یہ مئی کے آخری ہفتے کا پھل تھا گھروں میں سیبوں کے درختوں پر پھل ابھی موٹے بیروں جیسا تھا۔ گیلاس اور شوغون پک چکے تھے۔ صرف دو درختوں پر اسے آلو بخارا نظر آیا تھا۔

اور جیپ ایک آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ گھر زیر تعمیر لگتا تھا۔ صحن میں بجری اور پتھر پڑے تھے سارا کنبہ بڑے کمرے میں جمع تھا۔ ایک مشترکہ گھر جو وہ پیچھے چھوڑ کر آئی تھی، ایک اور مشترکہ گھر جو اس کا استقبال کر رہا تھا۔ روح اللہ کا بڑا بھائی ایم۔ ڈی خان سکردو کے ایک بڑے تعلیمی ادارے کا سربراہ تھا۔ ان کی لاہوری بیوی بہت اُلفت سے ملی۔

پر روح اللہ کی بیوی سیماں! تبریز کی پیداوار، سکردو کا قیمتی فیروزہ جسے دیکھ کر اس نے سوچا ''تبریز کا سارا حسن سمیٹ لائی ہے اور یقیناً پیچھے ایک قطرہ تک نہیں چھوڑ کر آئی ہوگی۔''

سیماں کے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو جب اس نے اپنے سینے سے لگایا۔ تب یوں لگا جیسے ابھی اس کی چیخیں نکل جائیں گی۔ آنسوؤں کی بارش شروع ہو جائے گی۔ پر وہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ آنسوؤں کو پلکوں کی چلمن میں چھپانا جانتی تھی۔ آہوں کا گلا گھونٹنے کا اسے سلیقہ تھا۔

نشست کا سارا انتظام قالین پر تھا جس نے پورے کمرے کو اپنے سرخ رنگ میں سمیٹا ہوا تھا۔ یوں اطراف میں صوفے بھی پڑے تھے۔ پر وہ تو شاید بے کار ہی جگہ گھیرے بیٹھے تھے۔ خاتون خانہ نے دسترخوان بچھایا۔ ملازم آفتابہ لایا۔ خواتین نے واہنے ہاتھوں کے بس پَپے دھوئے۔

تبھی ایک بوڑھی عورت مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ سارے میں وادی جواری کا شور مچ گیا۔ آنے والی کا چہرہ چاند کی کرنوں جیسا ٹھنڈا اور ملائم تھا۔ وہ سبز اونی کپڑے کی گن مو (قمیض) پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ ٹوپی جو بلتی مردانہ ٹوپی سے ملتی جلتی تھی (جس پر چاندی کے منقش زیورات جنہیں طومار کہتے ہیں سلے ہوئے تھے) سر پر رکھے اور اس پر سیاہ چادر اوڑھے

ہوئے تھی۔ اس نے گلے میں فلا پہنا ہوا تھا۔ (کپڑے کی پٹی پر بڑے بڑے فیروزے چاندی کے فریم میں جڑا کر سی دیئے جائے ہیں) ہاتھوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں اور پاؤں میں ہلم تھا۔ جس پر اتنی نفیس اور حسین وجمیل کڑھائی تھی کہ بہت دیر تک اس کی نظریں جوتی پر مرکوز رہیں۔ سیماں نے اس کی نظریں جوتوں پر گڑی دیکھ کر کہا۔

''یہ چھور بٹ کی خاص چیز ہے۔ آپ کے لیے بھی منگائیں گے۔''

''ارے نہیں سیماں۔'' اس نے تکلف کرنا شاید ضروری سمجھا تھا۔

دسترخوان پر اُبلے ہوئے سفید چاول، پالک آلو کی بھجیا، بھنا ہوا گوشت، اچار اور سلاد سج گئے۔ دادی جواری روح اللہ کے منجھلے بھائی سے اپنے اس بیٹے کی باتیں کرتی تھی۔ جو ٹیقشی میں رہتا تھا پر ''ٹیقشی'' ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں تورتوک اور چولونکھا کے ساتھ دشمن کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ ٹیقشی جیسی حسین وادی، اس وادی میں رہنے والا پہلوٹھی کا بیٹا، اس بیٹے کے بچے، بیوی ڈھور ڈنگر کھیت کھلیان سبھی دادی جواری کو مضطرب رکھتے تھے۔

اور چاولوں کا نوالہ اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔ جب اس نے سنا تھا کہ مسز گاندھی اپنی وفات سے قبل فاروق عبداللہ کے ساتھ تورتوک تک آئی تھیں، اور ان وادیوں کے باشندوں کو بے شمار مراعات دے کر گئی تھیں۔ لوگ اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہیں۔

''صاحب اقتدار نے تاریخ سے سبق حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اپنی چیزیں دوسروں کو دے کر بھلا یوں خاموش بیٹھا جاتا ہے۔''

اس نے بہت لمبی آہ سینے سے نکالی تھی اور پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا تھا کھانے کے بعد رکابیوں میں گیلاس اور شوغون آئے۔ اس نے جی بھر کران پھلوں کو کھایا پھر وہاں شور مچا۔ وہ لوگ دادی جواری سے گیت سننے کی فرمائش کرنے لگے۔ للّی نے ڈوہر محلے فزا اور آسیہ کے گھر فون کیا۔ فزا کا بیٹا اور آسیہ کا بھائی ڈیانگ اور ڈامن بجانے کے ماہر تھے۔ پر فزا اور اس کا بیٹا ''کھرمنگ'' گئے ہوئے تھے۔

اور پھر اس کمرے میں راگ ورنگ کی محفل جمی۔ دادی جواری بلتستان کی موسیقی پر ایک پورا مکتب تھیں۔ روح اللہ کا چھوٹا بھائی ڈاکٹر سیف اللہ کمرے میں آیا اور بولا۔

''ملکہ بلتستان تشریف لاتی ہیں۔''

اور یہ ملکہ بلتستان آسیہ تھی۔ اتنی خوبصورت اور تیکھی کہ واقعی ملکہ کہلانے کی حقدار۔

آسیہ کے بھائی نے ''ڈانگ شنگ'' (بجانے والی چھڑی) کے ساتھ اس مہارت سے ڈامن بجایا اور دادی جواری نے حزنیہ لے میں ''شنکشیر پا'' کا گیت گایا۔

سکردو کا نوجوان شنکشیر پا جسے گلاب سنگھ والئی جموں نے قیدی بنالیا تھا۔ اس کی دلاری بیوی کے جذبات واحساسات کا گیت۔

بیوی: جموں کشمیر سے آنے والے پیارے ماموں آپ کو میری جان شنکشیر پا کی خبر ہو تو مجھے بتائیں۔

ماموں: ماموں کی عزیز بھانجی میں نے اسے دیکھا تو نہیں۔ سنا ہے کہ وہ جموں کے قید خانے میں ہے۔

بیوی: ہاں ہاں وہ جو جموں کے قید خانے میں ہے وہی میرے بچپن کا ساتھی ہے۔

یہ خشک بنجر اور سنگلاخ چٹانوں والا علاقہ درحقیقت اتنا دلچسپ رنگین بلند پایہ فنون لطیفہ اور اعلیٰ تہذیبی روایات کا حامل ہوگا، یہ تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔



رگیالمو (شہزادی) شگری کی شادی ایک گھمبیر مسئلہ بن گئی تھی۔ یہ حسن کی مورت دنیا کی دو قدیم ترین تہذیبوں کا سنگم تھی۔ اس کے خدوخال اور صبیح رنگت میں اگر ایک طرف یونان جھلکتا تھا تو دوسری طرف اس کی شخصیت پر تبت کی چھاپ تھی۔

یہ شگری بالا کی شام تھی۔ سورج بس دیو قامت پہاڑوں کے پیچھے ڈبکی لگانے ہی والا تھا۔ اس وقت سطح مرتفع دیوسائی کی طرف سے آنے والی ہوائیں بہت تیز تھیں۔ وہ اس ٹیلے پر بیٹھی تھی۔ جس پر شگری خاندان کے رہائشی محل کے آثار کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ روح اللہ سیماں کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے تاریخ کا یہ عظیم ورثہ اسے سونپ رہا تھا۔

ہاں تو میں رگیالمو (شہزادی) شگری کے بیاہ کے قضیئے کو ابھی چھوڑ کر پیچھے لوٹتا ہوں اس زمانہ میں جب یہ میرا پیارا سکردو ابھی سکرمدو تھا۔ اس مہیب طوفان کے بعد آباد ہونا شروع ہوا تھا۔ اسی دوران مغرب کے دردستان کے اطراف سے بہت سے قبائل کے ساتھ ایک ایسا قبیلہ بھی آیا جو یونانیوں کی اولاد تھا اور سکندر اعظم کی طوفانی یلغار کے دوران ہندوکش کے پہاڑوں میں رہ گیا تھا۔ یہ لوگ شگری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ یہ دلیر، جری اور تنومند تھے۔ بہت جلد سارے علاقے پر چھا گئے اور ان کا سردار پورے علاقے کا رگیالفو (بادشاہ) بن گیا۔ مقامی آبادی پر تبتی رنگ غالب تھا۔ حاکم اور محکوم نے ایک دوسرے کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈبو دیا۔ اس خاندان کے آخری رگیالفو (بادشاہ) کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ صرف ایک بیٹی رگیالمو شگری تھی۔ وہی تاج شاہی کی وارث تھی۔

وزراء اور امراء جھگڑتے تھے۔ بالتی یل (بلتستان کا قدیمی نام) کے مقامی راجے بھی اس شہزادی کے ساتھ رشتہ جوڑنے کے لیے مرے جاتے تھے۔

تب یہ محل جس کے کھنڈرات پر ہم اس وقت بیٹھے ہیں۔ نہایت عالی شان تھا۔

شاید وہ بھی کوئی ایسی ہی شام ہوگی۔ اس شام بھی دیوسائی سے ہوائیں بہت تیز چل رہی ہوں گی۔ اپی چوشکری کے محل کی چھت پر شہزادی شکری اپنی سہیلیوں کے ساتھ چہل قدمی کرتی تھی ان کے درمیان چہلوں کا سلسلہ جاری تھا۔ رگیالموشکری کی بے تکلف دوست کہتی تھی کہ اس کے لیے کوئی شہزادہ ادھر سے آئے گا۔ ادھر کا یہ اشارہ دیوسائی کے پہاڑوں سے تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک اس کی نگاہ اس سیاہ پتھر پر پڑی۔ روح اللہ نے اپنے داہنے ہاتھ سے ایک پتھر کی طرف اشارہ کیا جو وادی جواری کے قریب ہی پڑا تھا۔

رگیالموشکری کی چیخ سی نکل گئی۔ ایک جوان رعنا اس پتھر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ ایسا وجیہہ کہ جیسے سورج دیوتا ہو۔ شہزادی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ وہ فقیر سا لگتا تھا۔ پر اس کے ایک ہاتھ میں سونے کی تسبیح اور پاس تھیلا پڑا تھا۔ یہی پتھر بردوسناس (چکی کے پاٹ کا سرہانہ) اس کے سر کے نیچے تھا۔

وہ دیکھتی رہی نوجوان نے مغرب کی سمت دیکھا۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ وہ اُٹھا اور نماز پڑھنے لگا۔ بدھ مت کی پیرو شہزادی کے لیے یہ سب بہت عجیب تھا۔ وہ نیچے بھاگتی آئی، اور اس کے پاس پہنچی۔ اس نے سلام پھیرا، السلام علیکم کہا۔ پر وہ تو ٹکر ٹکر اسے دیکھتی تھی۔ زمانہ شاید ساکت ہو گیا تھا بہت دیر بعد اس نے اپنی زبان میں پوچھا۔

''کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟''

وہ جوان رعنا مقامی زبان نہیں جانتا تھا۔ بس اس سوال کے جواب میں مسکراتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ سے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ اشارہ دیوسائی کی طرف تھا اور اپنا نام ابراہیم بتایا۔

وہ تو اسے کوئی دیوتا سمجھی تھی۔ بھاگم بھاگ باپ کے پاس پہنچی۔ پھولتی سانسوں کے

ساتھ اسے بتایا کہ ایک دیوتا ان کے دوارے آیا ہے، رگیالفو (بادشاہ) اپنے مصاحبوں کے ساتھ اس وقت بیٹی کے معاملے پر ہی بات چیت کر رہا تھا۔ جب بیٹی نے دامن کھینچا کہ تم اُٹھو اور چل کر اپنی آنکھوں سے تو دیکھو۔

اور رگیالفو بھی اسے دیکھتے ہی اپنے دل سے ہار گیا۔ اس کی صورت میں کچھ ایسی نرالی کشش کہ اس نے اس کے پاؤں چھوئے اور بصد منت وہاں سے اُٹھا کر مہمان خانے میں لائے۔

اور رگیالفو شگری کے بیاہ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اسے وہ یوں بھایا تھا کہ لختِ جگر کو اس اجنبی انجان اور ناواقف کے حوالے کرنے میں اسے عین راحت محسوس ہوئی۔ بیٹی سے بھی رائے لی گئی اور وہ بھی گھائل ہی نکلی۔

یوں وہ سلطنت بلتی یل کی شہزادی سے شادی کر کے یہاں کا داماد بنا۔ تبتی زبان میں گھر داماد کو مقپا کہتے ہیں۔ وہ ابراہیم مقپا ہوا جو بروئے آداب مقپون ہو گیا۔

درحقیقت یہ پہلا مسلمان تھا جو اس علاقے میں پہنچا اور مرتے دم تک اپنے مذہب پر قائم رہا۔

مستند تاریخی روایات کے مطابق یہ نوجوان رعنا مصر کے شاہی خاندان کا مفرور شہزادہ تھا جو پہلے کشمیر آیا تھا۔ وہاں کی خانہ جنگی سے اس نے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مقامی لوگوں نے بغاوت کر دی اور اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ وہ کشمیر سے بھاگتا ہوا براستہ دیوسائی سکردو پہنچا اور اس شہزادی سے ٹکرایا۔ جس کے بیاہ کے مسئلے نے باپ کی نیندیں اُڑا رکھی تھیں۔

اور یوں اس خاندان کی ابتداء ہوئی جس نے بائیس پشتوں تک نہایت کروفر سے حکومت کی۔ اس خاندان کے بادشاہ بوغا نے موجودہ سکردو شہر بسایا ناقابلِ تسخیر قلعہ کھرفوچو بنایا اور یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی ان کے خواہرزادے حضرت سید محمد نور بخش اور دوسرے ایرانی مبلغین یہاں آئے۔ ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر بوغا کا بیٹا شیر شاہ شرف بہ اسلام ہوا۔

''اف تو یہ روح اللہ'' سیماں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''تمہیں تو مکینکل انجینئرنگ کی بجائے آثارِ قدیمہ کی ہسٹری پڑھنی چاہیے تھی۔بس کرو۔اب کہف الوری آپا پریشان ہوگئی ہوں گی۔''

''احمق بلتستان کی تاریخ علی شیر خان انچن (عظیم) کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ نامکمل ہے۔اس تک پہنچنے کے لیے ماضی کے گڑے مردوں کی اُکھاڑ پچھاڑ تو ضروری ہے۔''

''ہاں تو وہ اولعزم فرمانروا جس کی عظیم فتوحات اور اصلاحات نے اسے تاریخ میں انچن (عظیم) بنایا۔شیر شاہ کا پڑپوتا علی شیر خان انچن تھا۔جس پر بلتستان کی تاریخ نازاں ہے۔

پہاڑوں کی شام، دل کش شام جہاں ٹھنڈی ہوائیں دامنوں سے چمٹی جاتی تھیں۔ جہاں خاموشی اور سناٹے کا حسن تھا۔ ریت کے ذرے اُڑتے تھے اور دھوپ کی زرگری آنکھوں کو بھاتی تھی۔

ایسے میں گرم چائے کا کپ کیسی بڑی نعمت تھی۔ سیماں پتھروں پر بیٹھی، گھونٹ گھونٹ چائے پیتی کیسی پیاری لگتی تھی۔ دادی جواری بھی اپنے بلم (جوتے) اُتارے بیٹھی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹا اس کا سرخ وسفید چہرہ، جوان گنت لکیروں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔جس کی ہر لکیر ایک دہائی کی داستان سناتی تھی۔ذرا دور سیاہ پرہیبت پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔

روح اللہ نے بلتی میں شاید جواری دادی سے کچھ کہا تھا۔ان کی آواز ان ویرانوں میں گونج اُٹھی تھی۔

ان ایام میں،ان ایام میں جب میرا یہ مادرِ وطن سکردو دودھ کے تالاب کی مانند ہوا کرتا تھا۔

ان ایام میں،ان ایام میں جب یہ سیاہ ریگستان سرسبز وشاداب ہوا کرتا تھا۔میرے علی شیر خان انچن نے دنیا کو زیر کیا۔

ارے!

میرے علی شیر خان انچن نے دنیا کو زیر کیا۔دنیا کو زیر کیا۔دنیا کو زیر کیا۔



وہ بہت دن چڑھے تک سوتی رہی۔ رات کے پہلے پہر خوابوں میں علی شیر خان انجن کے گھوڑے پہاڑوں پر دوڑتے رہے تھے۔ دوسرے پہر وہ زبیر کے ساتھ اپنے گھر میں تھی، اس سے گلے شکوؤں میں اُلجھی ہوئی۔ تیسرے پہر ایک ننھا منا سا بچہ اس کی چھاتی پر لیٹا کلکاریاں مارتا تھا اور جب اس کی آنکھ کھلی، ساری کائنات اُلٹی ہوئی تھی۔

سیماں دروازے میں کھڑی کہتی تھی۔

''آپ جلدی سے تیار ہو جایئے۔ روح اللہ نے چھٹی لے رکھی ہے۔ سد پارہ جھیل اور دیوسائی چلنا ہے۔''

اور جب وہ دانت صاف کرتی تھی تو اس سے بھی باتیں کئے جاتی تھی۔ جو اس کے دل میں بستا تھا۔

''پروردگار! اب میں اپنے ہی فیصلوں کو کسوٹی پر نہیں پرکھ سکتی۔ جانبداری کا دامن ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ پر میں چاہتی ہوں تو بھی میری طرح جانبدار بن جا۔ تو جانتا ہے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں اپنے آپ سے مجبور تھی اور مزید سمجھوتا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ بس تو اتنی سی التجا ہے کہ میرا دل پتھر کا کر دے!''

وہ باورچی خانے میں ہی آ گئی۔ بڑی بھابھی سارا کچن صاف کئے بیٹھی تھیں۔ نوکرانی نے مٹی کے چولہے لیپ دیئے تھے۔ فرش پر جو ملگجی سی دری بچھی تھی، وہ اس پر ہی بیٹھ گئی۔ للّی نے پلیٹ میں گھر کا بنا ہوا کلچہ، جس پر خشخاس لگی ہوئی تھی رکھ دیا۔ نمکین چائے کا پیالہ بھی آ گیا تھا۔

جب تک بڑی بھابی آئیں، وہ کلیجے پر سجے خشخاس کے سارے دانے چڑیا کی طرح ٹھونگ ٹھونگ کر کھا بیٹھی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اخبار لے کر بڑے کمرے میں آ گئی۔ ابھی پہلی خبر پر نظریں جمی ہی تھیں جب باہر سے روح اللہ کی آواز کانوں میں پڑی۔

''سیماں ڈاکٹر ابراہیم آئے ہیں۔''

سیماں شاید اس کی طرف آ رہی تھی غالباً دہلیز پر کھڑی تھی جب اس کی پُر مسرت آواز سماعت سے ٹکرائی۔

اللہ کیسا خوبصورت دن کتنا پیارا اور بھاگ بھرا مہمان آیا ہے۔

''بھاگ بھرا'' اس نے زیر لب کہا اور پھر خود ہی اپنے آپ سے بولی'' ہوگا کوئی بختاور، ہم جیسے نصیبوں جلے......''

اس کی تلخ سوچوں کا سلسلہ فی الفور ٹوٹ گیا جب چھ فٹی کشیدہ قامت پر متناسب وجود والا ایک مرد متانت سے قدم اُٹھاتا سیماں کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ بیٹھی تھی آنے والے پر سرسری سی ایک نظر ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ چہرے کا ہر نقش اپنی جگہ بلا کی جاذبیت رکھتا ہے اور نکھری ہوئی شفاف آنکھیں اپنے اندر شفقت اور نرمی سموئے ہوئے ہیں۔

غربی دیوار کے ساتھ ایک گز چوڑا اور تقریباً تین گز لمبا پھولدار ریشمی روئی سے بھرا گدیلا جو کشمیری طرز معاشرت کا ایک اہم جز ہے بچھا تھا۔ ڈاکٹر ابراہیم نے اسی پر بیٹھ کر اس کی طرف توجہ کی تھی اس کا تعارف کتنا مختصر تھا۔ پل لگا تھا۔ پر ڈاکٹر ابراہیم سیماں نے اسے آدمی سے انسان اور انسان سے فرشتوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا اور وہ خجل سے نادم سے ''سیماں آپ شرمندہ کرتی ہیں'' کہتے کہتے سر جھکائے جاتے تھے۔

''آپ ہمارے ساتھ دیوسائی چلیئے مزہ آئے گا''

''نہیں سیماں بی بی میں سکردو اسپتال میں کچھ اہم آپریشنز کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

اور اس نے سوچا کہ وہ جو زندگی میں کوئی اہم مشن پیش نظر رکھتے ہیں ان کے پاس وقت اور فرصت کہاں گھنٹہ بھر بعد وہ چلے گئے۔

سیماں نے چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا تھا۔

''محرومیاں جونکوں کی طرح ساتھ چمٹی ہوئی ہیں۔ ماں باپ تو بچپنے میں ہی چھوڑ گئے تھے۔ کس لگن اور ہمت سے پڑھا۔ شادی ہوئی تو بیوی کا بھی ساتھ نصیب نہ ہوا۔ چھ ماہ بعد ہی فوت ہو گئی۔ اب بلتستان کے دکھوں کو سینے سے لگالیا ہے۔ اس کے رگ و پے میں چبھے کانٹوں کو نکالنے میں دن رات جتے ہوئے ہیں۔''

''سیماں جلدی کرو'' روح اللہ نے آواز دی تھی۔

میری سب تیاری مکمل ہے بس چیزیں رکھنی ہیں''.........

اس نے پراٹھے کباب اچار اور چائے کے لیے کپ سب ٹوکری میں ڈال لیے تھے۔

شیبہ گلاب کا پھول بنی جیپ کے گرد منڈلاتی تھی۔ اس نے اسے گود میں اُٹھایا اور اندر جا بیٹھی۔

للی بھابھی طاہرہ سب سوار ہو گئے۔ سیماں روح اللہ کے ساتھ آگے جا بیٹھی اور گاڑی سٹیلائٹ ٹاؤن سے درہ سد پارہ میں داخل ہوگئی۔

دائیں بائیں آگے پیچھے گہرے چاکلیٹی اور سیاہ رنگے خوفناک قسم کے پہاڑ، اوپر تھوڑا سا نیلا آسمان نیچے میلا لاسندھ، سرمئی سڑک اور ادھر اُدھر بکھرے پتھر، بس یہی کچھ نظر آتا تھا۔

سد پارہ جھیل سکردو سے کوئی آٹھ کلومیٹر جنوب میں ہے۔ یہی کوئی آدھ پون گھنٹہ لگا ہوگا جھیل آ گئی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ اس کے قدموں کے عین نیچے سد پارہ جھیل کا پانی ہواؤں کے جھونکوں سے مچلتا پھرتا تھا۔ بائیں طرف ایک ریسٹ ہاؤس جو ناردرن ایریا ورکس ڈیپارٹمنٹ کے زیر انتظام تھا۔ اب محکمہ سیاحت پی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی دیکھ بھال کرتا ہے۔ سبز شیشے کی بلوریں، پیالی جیسی صورت والی اس جھیل کے عین درمیان ایک ٹاپو ہے۔ اس پر بھی دو کمروں کا ایک ریسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے۔ پر بے چارہ ریسٹ ہاؤس ہانپتا ہوا لگتا تھا۔

جھیل کے سبز پانی میں دخانی کشتیاں چلتی تھیں۔ ایک میں غیر ملکی چھوکرے اور چھوکریاں بیٹھے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر تھا ان کے دو رُک سیک ان کے جسموں سے الگ تھے۔ دوسری کشتی میں چند میدانی علاقوں کے لوگ تھے۔ دو شادی شدہ جوڑے سامنے ٹاپو کے کمروں سے نکل کر اب ادھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔

پھر وہ سڑک سے نیچے سیڑھیاں اُترتی گئی۔ بہت نیچے اور پھر عین جھیل کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

اور جب وہ بیٹھی پانی سے کھیلتی تھی۔ روح اللہ نے اس کی آنکھوں سے دوربین لگا دی اور ساتھ ہی بولا۔

''اوپر دیکھئے اوپر۔ یہی کوئی پانچ سو فٹ اوپر، ادھر سدپرگاؤں کی طرف روح اللہ اس کے عقب میں کھڑا اشارے دیتا تھا اور اب کسی پروفیسر کی طرح لیکچر پر اُتر آیا تھا۔

''رگیالفو (بادشاہ) علی شیر خان انچن کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ وہ دفاعی دیوار ہے۔''

اس نے غور سے دیکھا۔ اسے ٹوٹی پھوٹی شکستہ فصیل کے ٹکڑے نظر آئے تھے۔ یہ دفاعی دیوار کرتخشہ اور کرگل کے درمیانی پہاڑ سے لے کر استور تک پہاڑی سلسلے کے اوپر بنائی گئی تھی۔ کم و بیش سو میل لمبی اس دیوار میں مناسب جگہوں پر صدر دروازے اور ان دروازوں پر پہرے دار متعین تھے۔ تھور گو پر بھی ایسی ہی فصیل بنوائی گئی۔ تھور گو دروازے سے پہاڑ کے اوپر سدپارہ جھیل تک۔ سدپارہ جھیل پر بند باندھ کر اسے ایک ڈیم کی شکل دی گئی۔ جس سے اب تک سکردو کی نصف آبادی سیراب ہوتی ہے۔ اسی جھیل میں سے ایک اور چوڑی نہر نکال کر اسے ''نالہ خوشو میں ڈال دی گئی۔ اس نہر سے مغربی سکردو سیراب ہوتا تھا۔

تبھی سیماں چیخی ''پلیز! روح اللہ ہسٹری چھوڑ دو۔ کشتی خالی ہوگئی ہے۔ ہمیں سیر کراؤ۔''

سد پارہ جھیل ایک کلومیٹر لمبی اور تین بٹا چار کلومیٹر چوڑی ہے۔ اس سیر میں پورا گھنٹہ لگا وہ اور سیماں ٹاپو پر چڑھ گئے۔ وہاں جا کر اسے عجیب سے دکھ نے گھیر لیا۔

فضول ناس مارا ہوا ہے اس اتنی پیاری جگہ کا جگہ جگہ پتھر پڑے تھے۔ جھاڑیاں گھاس پھونس یہاں وہاں اُگا ہوا تھا۔

''کتنے پھوہڑ ہیں ہم لوگ قیمتی چیزوں کو سنبھالنے کا بھی سلیقہ نہیں۔''

جھیل کے کنارے ''سد پارہ ان'' میں شادی شدہ جوڑے صوفوں پر بیٹھے۔ شیشوں سے تاکا جھانکی بھی کرتے جاتے اور ساتھ چائے بھی پیتے جاتے۔

''اس جھیل کے پانی سے سکردو اور اس کے گردونواح میں بجلی کی فراہمی کے لیے دو بجلی گھر چل رہے ہیں اور مزید قائم کرنے کے منصوبے زیر غور ہیں۔''

بڑی بھابھی شدیداً اُکتا گئی تھیں۔ اونچی آواز میں بولیں۔

''بس کرو۔ اب آگے بھی چلنا ہے۔''

کھانا دیوسائی میں کھانے کا پروگرام تھا۔

روح اللہ شیشے کے گلاس میں چشمے کا پانی لایا، اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اسے پئیں! یہ سونے کے ذرات والا پانی ہے۔''

وہ ہنسی کہ شاید یہ مذاق کرتا ہے۔ لیکن جب وہ سنجیدگی سے بولا کہ میں حقیقت کہتا ہوں تب اس نے غور سے پانی کو دیکھا اور واقعی اسے دو تین سنہری ذرے نظر آئے تھے اور اس نے گلاس یوں منہ سے لگا لیا جیسے وہ آبِ حیات ہو۔

اب چڑھائی نہایت عمودی ہو گئی تھی۔ سڑک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔ گو روح اللہ کی جیپ بالکل نئی تھی مگر ہر چار چھ فرلانگ پر ریڈی ایٹر کا پانی ابل جاتا تھا۔ سیماں کین کا ڈبہ اُٹھائے جب سڑک کے اوپر بہتے کسی چشمے سے اسے بھرنے نکلتی، تب پیچھے بیٹھی للی ہنستی۔

''ارے شکر ہے سیماں آنٹی کہیں میں آپ کے ساتھ نہیں بیٹھی۔ وگرنہ تو میری آپ

نے پریڈ کروادی تھی۔"

جیپ ایک جگہ رُک گئی۔ روح اللہ نے اعلان کر دا ہم دیوسائی پہنچ گئے ہیں۔

بارہ سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر مرتفع دیوسائی کا میدان اس کے سامنے تھا۔ روح اللہ نے جیپ جس جگہ روکی تھی وہاں گوجر بکروال والوں نے اپنے کیمپ لگا رکھے تھے۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چرتے پھرتے تھے۔ درخت نہیں تھے۔ بس کہیں کہیں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

سیماں کے بچے بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے۔

چٹانوں کے پاس اس نے دسترخوان بچھا کر سب کو آواز دی۔

اور جب وہ کھانا کھاتی تھی، اس نے کہا۔

"روح اللہ! تمہاری اس دیوسائی نے مجھے ذرا متاثر نہیں کیا۔"

اس نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائی۔ اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ دیوسائی جتنی میری ہے، اسی قدر آپ کی بھی ہے۔ رہی بات متاثر ہونے کی تو ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ آتے ہی تو کھانے پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ ارے صاحب صبر سے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے ظہر کی نماز پڑھی۔ سب جیپ میں بیٹھے اور جیپ دیوسائی کے کھلے میدانوں میں بھاگنے لگی۔ سنہری مائل سبز گھاس کے میدان۔ ان میدانوں میں کھلے پھول دور کناروں پر ایستادہ وہ سرمئی پہاڑ جن کی چوٹیاں برفوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ راستہ کیا تھا رنگوں اور نظاروں کی دنیا ساتھ لیے چلتا تھا۔

ہم دیوسائی کی خوبصورت ترین جگہ بڑا پانی پہنچنے والے ہیں۔ روح اللہ کی جیپ چڑھائی چڑھتے چڑھتے اب ایکدم نیچے اُترنے لگی تھی۔ نیچے کا منظر کسی جادوگری کا تاثر دیتا تھا۔ سرسبز گھاس پھول شفاف نیلے پانیوں والا دریا۔ چوبی پُل۔

اُترائی خوفناک تھی اس سے بھی خوفناک چوبی پُل پر جیپ کا چلنا تھا۔ وہ جیپ سے اُتر گئی تھی۔ چند قدم چلی لیکن ایسے جیسے خواب میں چلتی ہو۔ پھولوں سے لدے پھندے یہ فردوسی ٹکڑے جن کی دید نے اس کے مُومُو کو سجدہ ریز کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کو بھگو دیا تھا۔ لگتا تھا اس کی آنکھیں پھٹ جائیں گی۔

نظروں کی ہرسمت پھولوں کا دریا بہتا تھا۔ پروردگار یہ تیری ذات کا چھوٹا سا ادنیٰ سا ذرہ ہے مجھے بتا تو خود کیا ہوگا۔

اُس نے نماز یہیں پڑھی۔

روح اللہ نے برجی لا کے متعلق بتایا۔ برجی لا دیوسائی کی بلند ترین ٹاپ۔ جیپ کا تو راستہ نہیں بس ہائی کنگ ہی وہاں سے جاسکتی ہے۔ کیا بات ہے اس جگہ کی۔

اب وہ جھیل شیوسر پر پہنچے۔ سبز گھاس کے میدانوں اور برف پوش پہاڑوں میں گھری یہ جھیل پریوں کا مسکن ہی تو معلوم ہوئی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے۔ روح اللہ نے فضا پر نظروں کے زاویے داہیں باہیں گھماتے ہوئے کہا۔

جسے برطانوی مورخ جی۔ ٹی وین نے Detosoh کہا ہے۔ ہم لوگ غبیارسہ (گرمیوں میں رہنے کی جگہ) کہتے ہیں۔ سردیوں میں یہاں گزوں کے حساب سے برف پڑتی ہے مئی میں جب برف پگھلتی ہے تو برف کے نیچے دبے پودے پھوٹ نکلتے ہیں۔ جس شام جب ہم شگری بالا میں بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ سیماں نے روح اللہ کی بات اُچک لی تھی اور آپ پوچھتی تھیں اتنی تیز ہوائیں، تو ان ہواؤں کی وجہ بھی یہی دیوسائی ہے۔

اوراب روح اللہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

دن ڈھلنے کے بعد، بستیوں میں درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ لیکن یہاں موسم خوشگوار رہتا ہے۔ یہاں کی ٹھنڈی ہوائیں تھنگ برگے سدپارہ اور حسین آباد کے نالوں سے وادی کی طرف بڑھتی ہیں، جو اکثر آندھی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

تبھی وہاں ایک جیپ آ کر رکی چند غیر ملکی اُترے۔ وہ تو اُترتے ہی تصویر کشی میں مصروف ہوگئے۔ سیماں اور روح اللہ بھی ایک پتھر پر بیٹھ کر تصویریں اُتر وانے لگ گئے، اور وہ کھڑی تھی۔ بس یوں کہ بس نہ چلتا تھا کہ کیوں کر اس نظارے کو آنکھوں میں جذب کر لے۔ یہیں ڈیرہ ڈال لینا چاہتی تھی۔ پھولوں کی اس سیج پر ہمیشہ کے لیے سو جانا چاہتی تھی۔

غیر ملکیوں کی جیپ کا ڈرائیور اس کی محویت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس آیا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔

''دیوسائی پر ہی عاشق ہوگئی ہیں۔ وقت اور حالات نے کبھی اجازت دی تو گلتری جانا۔ اسی سے آگے کا علاقہ ہے۔ علاقائی خاصیت ماحول اور موسمی حالات کے لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ سال کے آٹھ مہینے برف باری کی زد میں رہنے والا یہ علاقہ دنیا کی حسین ترین جگہ ہے۔ میں اسی علاقے کا ہوں تم یقین نہیں کرو گی۔ زندگی جتنی کٹھن اور دشوار وہاں ہے شاید دنیا کے کسی خطے میں نہ ہو۔''

وہ سنتی رہی۔ پھولوں کے سمندر میں آنکھوں کو غوطے دیتی رہی اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ یہ کہتے ہوئے کہ اگر وہاں کا دانہ چگنا ہوگا تو کوئی روک سکے گا۔ یہاں کا کب سوچا تھا؟



تیاری کے سب مراحل سے فارغ ہو کر جب اس کی مرمریں لانبی گردن اوپر اُٹھی، اوراس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ سیماں پیچھے کھڑی عنابی ہونٹوں کے ساتھ مسکراتی نظر آئی تھی۔ اس نے دو قدم آگے بڑھائے اور عین اس کے بالمقابل آ کر بولی۔

''آپ میندوق کھر (پھول محل) اور عظیم تاریخی قلعہ کھر پو چو دیکھنے جا رہی ہیں اور میندوق رگیالمو (پھول شہزادی) کا روپ دھارے ہوئے ہیں۔ بتایئے تو ذرا اگر علی شیر خان انچن کی روح نے آپ کو پھی ڈال لی تو میں کیا کروں گی۔''

اس نے سیماں کے گال پر پیار کیا اور بولی۔

''اگر ایسا ہوا تو مجھے وہیں چھوڑ آنا۔ ایسا عظیم فرمانروا مجھ پر فریفتہ ہو جائے، تو بھلا اس سے بڑھ کر خوشی کی اور بات کیا ہو گی۔''

اور دونوں کا قہقہہ کمرے میں گونج اُٹھا۔

وہ اس وقت سبز بلتی گن مو (قمیض) پہنے کھڑی تھی۔ لانبے بالوں کی دو چوٹیاں اس کے سینے پر شیش ناگوں کی طرح پڑی تھیں۔ اس کے سر پر سیندوری ٹوپی تھی۔ جس کی پیشانی پر سجے طومار (چاندی کے منقش زیورات) جھلمل جھلمل کرتے تھے۔ فلو (گھنگھرو) اس کے ماتھے پر جھومر کی طرح پڑے تھے۔ سیماں نے اس کے گلے میں اپنا فلا بھی پہنا دیا تھا۔ تنگ مہری کی گھیر دار شلوار کے نیچے اس کے پاؤں میں چھور بٹ کا حسین و جمیل کشیدہ کاری، ہلم (جوتا) بھی تھا۔ بلتی گن مو، ٹوپی اور ہلم تینوں چیزیں روح اللہ اس کے لیے کل شام لایا تھا۔

اس نے چادر اوڑھی اور بولی۔

''اب چلنا چاہیے۔''

اور سیماں کمرے سے باہر نکلتے نکلتے کہتی گئی۔

''میں تو سوچتی ہوں آپ کا بیٹی کسی بلتی سے نکاح پڑھوا دیں۔''

اس نے یک دم اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا۔ رُخ پھیر کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا اور خود سے کہا۔

''نکاح تو پڑھا تھا۔ بور کے یہ لڈو کھائے بیٹھی ہوں۔ پھر جیسے زبیر اندر سے چھلانگ لگا کر اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا اور اسے اپنی بانہوں میں جکڑتے ہوئے بولا۔

''تم ایک اور نکاح کرو گی۔ مجھے چھوڑ کر۔''

اور اس کے اندر کا دکھ بلبلا کر چیخا۔

''مجھ جیسی بانجھ سے کسی کو کیا سروکار؟''

اور اس نے آنسو پلکوں پر جھلملانے نہیں دیئے۔ چادر سنبھالتی باہر بھاگی۔

سیماں نے بچے بڑی بھابی کے حوالے کیے۔ نوکری اُٹھائی۔ اپنے ملازم جذبہ کو ساتھ لیا اور تینوں سیٹلائٹ ٹاؤن کی سڑکوں سے نیچے اُترتی گئیں۔ سکمید ان کی گلیوں سے بازار میں آئیں اور سیماں نے بس ذرا سی آنکھیں ننگی رکھ کر بھاگتے ہوئے بازار پار کیا۔

امام باڑہ کلاں میں ترکھان کام کر رہا تھا، وہ ٹھہر گئی۔ چوب کاری میں وہ پنجرے کی کوئی قسم بنا رہا تھا۔ اس کے سراہنے پر سیماں بولی تھی۔

دراصل یہ اتنا مہنگا پڑتا ہے کہ اجتماعی تعمیرات کے سوا عام آدمی انہیں بنوانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ آگے بڑھنے لگی تھی۔ جب جذبہ نے اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے کہ بلتستان جب اپنی جنگ آزادی لڑ رہا تھا تو اسی جگہ اور اسی مقام سے قلعہ کھرپوچو تک پہنچنے کے لیے سرنگ کھودی گئی تھی۔

اس نے وہاں ٹھہر کر اک ذرا سی دیر کے لیے ان مناظر کو تصور کی آنکھ سے دیکھنا چاہا پر سیماں تیز رو پر سوار تھی۔ دامن کھینچ کر بولی "چلی آؤ یہاں تو ہر تیسرے قدم پر تاریخی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔انہیں سننے لگو گی تو پہنچ چکیں گھر پر چو۔"

پولوگراؤنڈ کے نزدیک سیز رگر کھور کا علاقہ تھا۔ یہاں وہ سنار رہتے تھے جو کشمیر سے آئے تھے۔ اب وہ چھیپا کھور میں داخل ہوگئی تھیں۔ یہ جگہ ان کاشتکاروں کی ہے جو راجہ کے مزارع تھے۔ راج گیری نظام ختم ہوا تو انہوں نے زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ اب مقدمے درج ہیں۔ حاکم اور محکوم دونوں عدالتوں میں پیشیاں بھگتتے ہیں۔"

سامنے چھومک کا علاقہ نظر آتا تھا اور آگے دریائے سندھ موجیں مارتا پھرتا تھا۔

"بے چارہ چھومک" جنہ بہ نے زبان تالو سے لگا کر زوردار چچ چچ کیا۔ سندھ جب چڑھا، چھومک پھنسا۔

اب انہوں نے مینددق کھر (پھول محل) کے لیے چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ چڑھائی میں سانس بہت جلدی پھولتا ہے۔ ایک جگہ وہ رُک گئی۔ اس نے نیچے دیکھا۔ وادی سکردو اس الببیلی شہزادی کی مانند نظر آئی تھی جو دیو قامت جنوں کی قید میں پڑی ہو۔

مینددق کھر شکستہ دیواروں کی صورت میں کھڑا تھا، اور سیماں بول رہی تھی۔ علی شیر خان انچن کی محبوب ملکہ گل خاتون کا مینددق کھر۔ یہ مغل اور تبتی طرز تعمیر کا ایک خوب صورت مرقع جس کے فرش اور چوکھٹیں سب سنگ مرمر سے بنے ہوئے تھے۔

"تم لوگ بھی عجیب ہو، اس عظیم تاریخی ورثہ کو بھی نہ سنبھال سکے۔ اب مجھے بتاتی ہو کہ مغل اور تبتی طرز تعمیر کا دل کش مرقع ہے۔"

اور سیماں نے بے چارگی سے کہا۔

"میری جان ہم تو اپنے آپ کو بھی نہ سنبھال سکے تھے۔"

وہ دونوں پتھروں پر جوتے اُتار کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس نے ٹوپی اور چادر اُتار دی سیماں

نے اپنی پونی جیسی انگشت شہادت بلند کرتے ہوتے کہا۔

وہ سبز رگر کھور کا علاقہ ہے جہاں سے ہم آئے ہیں۔یہیں مقپون بادشاہوں کا ہلال باغ تھا۔ہلال باغ میں غوزی ہل چنگڑا کا چبوترہ ابھی تک اسی طرح قائم دائم ہے۔چھومیک کی طرف رگیہ ژہر کا شاہی باغ تھا جواب دریا برد ہو چکا ہے۔ہلال باغ کے قریب شاہی قبرستان ریت کے ٹیلے کی صورت میں موجود ہے۔

یسماں نے نوکر کو چھتری کھول دینے کا کہا تھا اور پانی کا گلاس اس کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا۔

عین سامنے سد پارہ درہ تھا۔ نیچے چھومیک کا علاقہ جہاں عورتیں گھاس کاٹتی تھیں چھتوں پر خوبانیاں اور توت پڑے سوکھتے تھے۔

سکردو چھاؤنی میں کہیں کہیں ٹین کی چھتیں سورج کی روشنی میں چمکتی نظر آتی تھیں۔ اس نے گردن اُٹھا کر اپنے اوپر پھیلے تین سوفٹ اونچے کھرپوچو کو دیکھا جس کی چوٹی پر انہیں پہنچنا تھا۔اس کے پاؤں ان راہوں سے ناآشنا کہیں جو ذرا سا پیر پھسلا اور نیچے سنگے چھو (دریائے سندھ کا مقامی نام) کی جولانیاں اپنے آپ میں سمیٹنے کے لیے مشتاق......... اس نے جھرجھری لی۔

دھیرے دھیرے رک رک کر جگہ جگہ ٹھہرتے ہوئے وہ ڈونگس کھر تک پہنچیں۔

یہ راستہ جس پر سے ہم چل کر یہاں تک پہنچے ہیں،علی شیر خان انچن کی محبوب ملکہ مینددق رگیالمو (پھول شہزادی) نے ہی بنایا تھا۔

وہ ڈونگس کھر کی شکستہ اور نوکیلی دیواروں کے پاس بیٹھ گئیں۔اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی اور جذبہ نے روح اللہ کی کرسی سنبھال لی تھی۔

''یہاں ایک حفاظتی چوکی بنی ہوئی تھی، جس پر پہرے دار متعین رہتے تھے۔ اسے مزید آگے بڑھنے سے اس نے یہ کہتے ہوئے روک دیا۔

''خدا کا کچھ خوف کرو، جذبہ پہلے چائے تو پلا دو۔''

اور جب چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں آیا، اس نے اوپر نیچے اور اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ اس وقت آسمان شفاف اور نیلا تھا۔ کائنات بس ہمالیائی اور قراقرم کی دیواروں میں سمٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

تازہ دم ہو کر پھر اٹھے۔

گیٹ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں رنگ و روپ کھوئے بیٹھا تھا۔

اس قلعہ کے بیرونی دروازے پر شیر کا مجسمہ نصب تھا۔ دروازے کے سامنے ایک بڑا چوپال تھا۔

ڈوگرہ فوج نے آخری مفتوح بادشاہ کو گرفتار کر کے اسی چوپال میں لا کر قالین پر بٹھایا تھا۔ شہزادیوں اور بیگمات کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا۔ یہ کیسا اندوہناک منظر تھا۔

اور اس نے دُکھ اور کرب کے سمندر میں غوطہ مارتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

''صرف اندوہناک نہیں، انسان تو جیتے جی قبر میں اُتر جاتے ہیں۔ آن بان شان عزت و جاہ و حشمت سب کچھ منوں مٹی کے نیچے دب جاتا ہے۔ پلٹن میدان ڈھاکہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ سقوطِ دلی اور سقوطِ بغداد تو کتابی المیے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ تو اس کی روح، اس کے جسم و جان کا المیہ تھا۔

جذبہ نے اونچے اونچے گانا شروع کر دیا۔

میری نچیا اشچونگ دشمنی چھرے کھیریدے چو امیر حیدر

فوژے سنگے ژوخ یورپی کھیودپو ورنگ بانی فیونی لے چو امیر حیدر

ترجمہ: اے راجہ امیر حیدر! تمہاری عزیز شہزادیوں کو دشمن اسیر کر کے لے جا رہے ہیں اے راجہ تم میں جو شیر کی طاقت ہے، وہ آج دکھاؤ۔

یہ محل کی اس معمر عورت کی فریاد تھی۔ جو یہ ستم برداشت نہ کر سکی اور اس نے اسی قلعہ

کھر پوچو میں ہی موت کی نیند سونے والے شہزادے امیر حیدر کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔

اس عظیم قلعہ کھر پوچو کو مقپن راجہ بوغا نے تعمیر کروایا تھا اور اس کے پڑپوتے غازی میر کے بیٹے علی شیر خان انچن نے اسے فوجی نقطہ نظر سے وسعت دی۔

پر وہ تو وہاں کھڑی صرف یہ سوچتی تھی کہ وہ جنھوں نے اسے تعمیر کیا جن تھے یا دیو، منوں وزنی پتھر سینکڑوں فٹ بلندی پر لائے اور اسے یوں بنایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ماورا ہاتھوں کی کاریگری کا گمان پڑتا ہے۔

دائیں ہاتھ آٹھ بڑے مورچے تھے۔ان مورچوں پر چھت نہیں تھی، اور جب اس نے ان سوراخوں میں جھانکا۔آدھا سکردو نظر آتا تھا۔سارا قلعہ ایک چبوترے پر بنا ہوا ہے۔ فصیل کے ساتھ ساتھ دو منزلہ عمارت اردگرد تعمیر تھی۔مین گیٹ کے قریب مسجد بنی ہوئی تھی۔ ڈوگرہ وزیر لکھپت رائے نے مسجد کے سوا سب کچھ جلا ڈالا تھا۔مہتہ سنگھ نے اسے دوبارہ تعمیر کروایا۔قلعے کے بیچ میں چٹان کھود کر ایک حوض بنایا گیا ہے جس کا سائز تقریباً بارہ ضرب بارہ فٹ ہے۔اس میں پانی جمع رکھا جاتا تھا۔قلعہ میں پانی لانے کے لیے شمالی جانب سے دریائے سندھ کے کنارے تک زمین دوز راستہ موجود تھا۔مسجد کے قریب دیوار میں موجود ایک کالے پتھر پر اشعار کندہ تھے۔اس کے پوچھنے پر جذبہ نے بتایا تعمیر کا سنہ ہے۔

مغربی حصے میں ایک اونچی جگہ پر راجہ صاحب کا محل بھی تھا۔پر اس کا کوئی نام ونشان موجود نہیں تھا۔ایک گول کمرے کے جھروکوں میں سے تازہ ہوا کے جھونکے اور دریائے سندھ نظر آتا تھا۔

وہ گھومتے رہے، چپ چاپ روحوں کی طرح۔پھر چلتے چلتے اس دروازے تک آ گئے۔جو ننگ ژھوق کی طرف تھا اور اپی چوئے سو کے نام سے مشہور تھا۔دیواریں نیم خستہ تھیں۔جذبہ بول رہا تھا اور اس کی انگلی بندوق کی نال کی طرح کسی جگہ کا نشانہ لے رہی تھی۔

''وہ دیکھیے جہاں دریائے شگر دریائے سندھ میں گرتا ہے۔وہیں ننگ ژھوق کی بستی

ہے۔ جس کے معنی ہیں کانٹوں کا گھر۔ کبھی یہ گاؤں بہت اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن دریائے سندھ کے کٹاؤ سے اس کا بیشتر حصہ دریا برد ہو گیا۔ دریا جس جگہ بہہ رہا ہے، اس کے عین درمیان راجہ سکردو کا تفریحی محل بھی تھا۔ یہ جگہ سکردو اور باہر سے آنے والوں کے لیے ایک پُر لطف سیر گاہ ہے۔ یہاں بڑے بڑے چناروں تلے ایک چشمہ بہتا ہے۔ منچلے چاقو اور چھریوں سے ان تناور چناروں پر اپنے نام کھود کھود کر لکھتے ہیں۔

''کہیں بیٹھ جاؤ اب سیماں پلیز! میں تھک گئی ہوں۔ مینڈوق کھر کی خستہ حال دیواروں کے گلے لگ کر مجھے وہ کہانی سننا قبول نہیں۔ کیونکہ میری ٹانگیں بے جان ہیں۔''

جذبہ نے وہیں صاف سی جگہ پر دسترخوان بچھاتے ہوئے اپنی گلابی اردو میں کہا۔

لیجئے ابھی سے ڈھیر ہو گئیں۔ اتنی نازک تو نہیں دکھتیں، جتنا ظاہر کرتی ہیں۔''

''کمبخت'' وہ غصے سے چلّائی ''تیرا کلیجہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا جو تھے آسمان پر تو تو مجھے لے آیا ہے۔ اور اس نے پوری بتیسی کھولتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھائیے اب۔''

اور جب وہ آسمان کی وسعتوں اور زمین کی پہنائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ سیماں نے تاریخ کے ورق اُلٹ دیئے تھے۔



اس وقت پولو گراؤنڈ میں سنتغرا موسیقی بج رہی تھی۔ اس نے ڈفوق (گول ہونے کے بعد گیند کو پہلی ہٹ مارنا) مارا تھا۔ جو مقدر کا سکندر تھا۔ جس کی فراخ اور پُرعزم پیشانی پر اس کے اندر اور باہر کی شجاعت اور دلیری رقم تھی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش اور خم اس کی طاقت اور سختی کا نمائندہ تھا۔

اب تاجور دھن بج رہی تھی۔ اس دھن کے ساتھ قرنا (ایک بہت بڑا اور لمبا بگل) کی آواز نے فضا کو بہت پُر ہیبت بنا دیا تھا۔ اس وقت پیڑوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے اور بالتی ئل کا تاجدار اور عظیم فرمانروا علی شیر خان انچن پولو کھیل رہا تھا۔

پھر وہ رُک گیا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر موسیقی بند کرنے کا اشارہ کیا۔ فضا کو سونگھا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں جا کھڑا ہوا۔ جہاں خدمت گار سر جھکائے مودب ایستادہ تھے۔ اسے خبر ملی تھی کہ دلّی میں اس کی بیٹی شہزادہ سلیم کی پہلی ملکہ سخت بیمار ہے۔

اس نے ماتھے کا پسینہ دائیں ہاتھ کی پہلی پور سے صاف کیا۔ ایک ثانیہ کے لیے اُفق کو دیکھا اور گھوڑے کو سرپٹ بھگا تا محل میں آیا۔

پھر وہ ننگے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور پڑاؤ پڑاؤ ٹھہرتا دلی پہنچا۔

اور جب وہ بہ نشینوں اور غلام گردشوں میں سے گزرتا ہوا محل کے اس حصے میں پہنچا۔ جو تبتی شہزادی کے لیے مخصوص تھا اس وقت فانوس جل اُٹھے تھے۔

کنیزیں آداب بجالائی تھیں۔ اس نے قدم اندر رکھا تھا اور دیکھا تھا کہ بیٹی چھپر کھٹ

پر آنکھیں موندے پڑی ہے اور پاس کوئی کھڑا ہے۔ اس کی ایک نظر بیٹی پر اور دوسری بے اختیار ہو کر اس وجود پر پڑی تھی جو ایستادہ **مجسّمہ بنا ٹکٹکی** باندھے ٹھہرا اور زیادہ دیر نہیں رہا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اُلجھ گیا کہ کوئی جیتا جاگتا انسان دیکھ رہا ہے یا کوئی ماورائی شے ہے۔

بیٹی نے آنکھیں کھولیں۔ ہاتھ بڑھایا۔ باپ نے اُسے تھاما اور بوسہ دیا۔ پھر جُھکا اور اس کے قریب بیٹھا۔

وہ چلی گئی تھی اور بالتی یُل کے تاجدار کو محسوس ہوا تھا جیسے کمرے میں جلتے سارے فانوس آناً فاناً بُجھ گئے ہوں۔

وہ بیٹی سے باتیں کرتا رہا، بالتی یُل (بلتستان) اور خاندان کی۔ اور اس نے نہیں پوچھا کہ وہ کون تھی۔ پھر یہ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا۔ وہ اگلی سہ پہر بیٹی کے پاس گیا۔ دونوں کے درمیان ابھی گفتگو کا آغاز ہوا ہی تھا۔ جب وہ آئی اور اس نے کہا۔

''تم نے سیب کا جوس نہیں پیا۔ کیوں؟ یوں کھانے پینے سے منہ موڑ رہی ہو۔ کمزوری بہت بڑھ جائے گی۔''

تبھی شہزادی نے کہا۔

''میں نے بہتیرا چاہا، پر میرا اندر اسے قبول کرنے سے انکاری تھا۔'' اس نے چند لمحے اُسے دیکھتے رہنے کے بعد کہا تھا۔ ''آؤ بیٹھو۔''

وہ خود بیٹھنا چاہتی تھی، پر رانی ماں سے خوفزدہ تھی۔ رانی ماں کی خادمائیں اسے محل کی رتی رتی خبر پہنچاتی تھیں اور اسے اپنی تکا بوٹی کروانا پسند نہ تھا۔ لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ کچھ معاملات اختیار سے باہر ہو جاتے ہیں۔

بیٹی نے تکان کے باعث آنکھیں مُوند لی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا یوں گویا جیسے اپنے آپ کو دیکھا ہو اور یہی وہ لمحے تھے کہ بس یوں لگتا تھا جیسے پہچان کا سارا سفر طے ہو گیا ہو۔

اس سہ پہر وہ بہت دیر تک علی شیر خان انچن سے بالتی یُل، کشمیر اور لداخ کی باتیں کرتی رہی۔ رانی ماں کا ڈراؤنا بھوت دماغ کے کسی کونے کھدرے میں پڑا رہا اور وہ وجاہت اور شجاعت کے اس پیکر سے ایک نیا رشتہ استوار کرتی رہی

اور تب دفعتاً اس نے کہا۔

''آپ آیئے نا بالتی یُل۔''

اس وقت اس کی آنکھوں میں وارفتگی کا جنون تھا اور وہ دونوں شانے جھکائے پوری طرح اس کی اور متوجہ تھا۔

تب باغ میں تیز ہوائیں چلتی تھیں۔ جامن اور آم کے پیڑوں کے پتے تالیاں بجاتے تھے اور دل بھی کسی کو پالینے کی خوشی کی تال پر رقصاں تھا۔

پھر اگلی شب خواجہ سرا آیا۔ اس نے جھک کر تعظیم دی اور کانوں میں سرگوشی کی کہ شہزادی گُل خاتون اسے پائیں باغ میں ملنا چاہتی ہے۔

اس نے اس پیغام کو سنا۔ اس وقت کمرہ فانوسوں کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اس روشنی کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بڑی ٹھوس آواز میں بولا۔

''کہنا چوروں کی طرح رات کی تنہائی میں ملنا بالتی یُل کے تاجدار علی شیر خان انچن کو زیب نہیں دیتا۔ میں اسے دن کے اُجالوں میں لینے آؤں گا اور بالتی یُل کی رگیالفوچھمو (ملکہ خاص) بناؤں گا۔''

اور خواجہ سرا نے کمرے سے باہر نکل کر اپنے آپ سے کہا تھا۔

''اس آواز اور لہجے کا دبدبہ اور گونج کسی طور بھی ظلِ سبحانی سے کم نہیں۔''

وہ اس کی بیار بیٹی کی دنیا میں آخری شب تھی۔ اُسے لحد میں اتار کر وہ واپس آ گیا۔ جہاں اس کے ساتھ ایک دکھ آیا تھا، وہیں ایک جگمگاتی کرن بھی آئی تھی جو اس کی بند آنکھوں میں گھس گھس جاتی تھی۔

پھر اس نے شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کی خدمت میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اسے بے کل بنائے ہوئے تھی اور شہنشاہ نے کمال شفقت اور محبت سے اس کی اس خواہش کی تکمیل کی اور یوں وہ جلال الدین اکبر کی چچازاد بہن گل خاتون کو جاہ و جلال اور شان و شوکت سے بیاہ کر لے گیا اور اسے مینددق رگیالمو کا خطاب دیا۔

بس وہ ایسے ہی دن تھے جب پہاڑوں پر جمی برف پگھل جاتی ہے اور دریائے سندھ اپنے شباب پر آ جاتا ہے۔ان دنوں وہ نگ ژ ہوق میں اسی جگہ جہاں اب دریائے سندھ بہتا ہے، اپنے تفریحی محل میں آئی ہوئی تھی۔ سنہری شاموں میں اس کے دراز گیسو علی شیر خان انچن کے شانوں پر بکھر جاتے۔ وہ آسمان کی نیلاہٹوں کو دیکھتے دیکھتے کھرپوچو پہاڑ پر آ رکتی قلعہ دیکھتی اور کہتی۔

''میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔''

اور وہ اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے کہتا۔

''مینددق رگیالمو! تمہارے پاؤں پھولوں سے زیادہ نازک ہیں۔ قلعے کا راستہ بہت ٹیڑھا میڑھا اور اُلجھا ہوا ہے۔ بھلا تم وہاں کیسے جا سکو گی؟''

اور پھر ایک دن اس نے اپنے دل میں کہا۔

''میں اس پُر اسرار، اُلجھے ہوئے پیچیدہ اور دشوار گزار راستے کو سیدھا سادا اور سہل بناؤں گی۔''



''یقیناً میں جدت کی خواہاں ہوں یا یہ بھی ممکن ہے کہ میں ان محلات کے یکساں طرز تعمیر سے اُکتا گئی ہوں۔ پر یہ بھی حقیقت ہے کہ میں ان فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں اپنے ماضی کی کوئی چیز دیکھنا چاہتی ہوں۔''

مینددق رگیالمو (پھول شہزادی) اس وقت محل کی بالکونی میں بیٹھی بہت دور پہاڑوں پر نظریں جمائے، اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ فضا بہت خنک تھی۔

ان دنوں وہ تنہا تھی۔ اس کا محبوب علی شیر خان انچن تین ماہ ہوئے گلگت اور چترال کو فتح کرنے گیا ہوا تھا۔

اس صبح جب وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ چھوغولمنہ کی دھنیں بج رہی تھیں۔ لشکر کوچ کے لیے تیار کھڑا تھا۔ باہر سیاہ ننگے پہاڑوں پر سورج کی کرنوں میں برف کی چاندنی مسکراتی تھی، اور اندر اس کی گھنی سیاہ پلکوں میں اٹکے آنسوؤں کے برف جیسے سفید موتی، اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹوں کی کرنوں سے ہنستے تھے۔

اس نے اس کی ناک کے چہارگل (کوکا) کے قیمتی جھلملاتے پتھر کو اپنی انگلی سے چھوا پھر اس کی پیشانی پر طویل بوسہ دیا اور کہا۔

''علی شیر خان انچن ہمیشہ تمہیں خود سے قریب پائے گا۔''

اور جب وہ سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کی آوازیں سنتی تھی

کی خاص دھن ان آوازوں میں دب سی گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں کھول دیئے تھے اور کہا تھا۔

''اے اللہ! میں اسے غازی کی صورت میں دیکھوں۔''

پھر اس کے شب و روز اس محل کو بنانے کی تگ و دو میں گزرنے لگے جو وہ اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق بنانا چاہتی تھی۔ سارا سکردو اس نے چھان مارا۔ تب جا کر میندوق کھر کے لیے جگہ منتخب ہوئی۔ کاریگروں اور ماہرین فن کا انتخاب ہوا اور یوں سنگ مرمر سے بنا ہوا یہ محل اور اس سے ملحقہ باغ جب تیار ہوا علی شیر خان انچن گلگت کو فتح کرتا ہوا چترال کی طرف رواں دواں تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہوئے دو سال بیت گئے تھے۔ وہ خوش تھی کہ اس نے ایک خوبصورت چیز تعمیر کروائی۔ مگر اب اسے ایک نئی فکر لاحق تھی۔ باغ کی شادابی کے لیے پانی درکار تھا اور سکردو کی کسی عام کو ہل سے اس تک پانی پہنچنا مشکل تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ جب وہ فاتح بن کر لوٹے تو عظیم الشان میندوق کھر دلکش اور خوش نظر باغ، اہل سکردو کے ساتھ ساتھ اسے خوش آمدید کہے۔ طویل سوچ و بچار کے بعد اس نے دہلی سے گنگو نامی ماہر معمار بلایا۔

ہنر مند کاریگر سکردو پہنچا اور خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔

میندوق رگیالمو نے کہا۔

''میں چاہتی ہوں یہ نہر باغ کو زندگی دینے کے ساتھ ساتھ سکردو شہر کی زرعی زندگی کی بھی جان بنے۔

''پھر اس معمار نے تفصیلی معائنہ کیا، صورت حال کو دیکھا۔ اس کا باریک بینی سے جائزہ لیا، اور ملکہ کی خدمت میں عرض کی۔

''مطمئن رہیے، آپ کی خواہش کے عین مطابق یہ نہر تعمیر ہوگی۔ مگر ایک درخواست کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

اور میندوق رگیالمو ہنس پڑی تھیں کہ معمار نے کہا تھا کہ یہ نہر اس کے نام پر ہوگی۔

''چلو ہمیں تمہاری یہ شرط منظور'' اور گنگو پی آداب بجالاتے ہوئے اُٹھ گیا تھا۔

دفعتاً سیماں ماضی سے چھلانگ مار کر حال میں آوارد ہوئی۔ گنگو پی نہر ابھی آپ نے نہیں دیکھی۔ دیکھیں گی تو پتہ چلے گا کہ ایسے وزنی پتھر اس میں استعمال ہوئے ہیں کہ بس یوں لگتا ہے جیسے یہ جنات نے جمع کئے تھے۔ حالانکہ اس نہر کو بنانے میں جن مزدوروں نے کام کیا وہ علی شیر خان انچن کے فوجی معیار کے مطابق نااہل اور کمزور تھے! اور اسی بناء پر وہ انہیں اپنی مہم میں ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ آپ اب خود سوچ لیں کہ جب کمزور اور نااہل لوگوں کی جسمانی طاقت کا یہ عالم تھا تو فوجی معیار پر پورے اُترنے والے لوگ کیسے ہوں گے۔

اور پھر گنگو پی نہر بنی۔ سیماں غڑاپ سے پھر ماضی کے دریا میں کود گئی تھی۔

نہر کیا بنی، باغ شاداب ہوا۔ سکردو کے کھیت شاداب ہوئے پانی کی فروانی ہوئی۔ غلّہ اور چارے کی بہتات ہوئی اور لوگوں نے بے اختیار کہا۔

''ملکہ مینڈوق کھر ہمارے سروں پر سلامت رہے۔''

اور ایک رات جب وہ سونے کے لیے جارہی تھی۔ اسے دفعتاً یاد آیا کہ اس نے ابھی ایک اور اہم کام بھی کرنا ہے اور وہ قلعہ کھرپوچو تک پہنچنے کا آسان اور سیدھا راستہ ہے۔

معتمد درباریوں نے اس کا ارادہ جان کر کہا۔

مینڈوق رگیالمو چھمو (پھول شہزادی یا پھول ملکہ خاص) یہ خواہش جانے دیجئے۔ رگیالفو انچن اسے پسند نہیں کریں گے۔ قلعے کا راستہ ہمیشہ عام پیروں کی دسترس سے پوشیدہ ہونا چاہیے۔

اور اس نے کسی قدر غصے سے کہا۔

''یہ صرف میرا اور رگیالفو (بادشاہ) کا معاملہ ہے۔ آپ لوگ حکم کی تعمیل کریں۔''

اور حکم کی تعمیل ہوئی۔ کھرپوچو تک پہنچنے کا وہ راستہ بنا، جس پر ہم ابھی چڑھ کر آئے ہیں۔

ان دنوں وہ مجسم انتظار بنی ہوئی تھی۔ سارے کام ختم ہو گئے تھے۔ وہ تھک چکی تھی۔ تنہائی کا جان لیوا احساس اب اسے تڑپانے لگا تھا۔ مینددق کھر کے جھروکوں سے سندھ کے نظارے اسے بہت بے کل کرتے تھے، اور جب ایک اُداس سی شام وہ دور پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کو دیکھتی تھی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

"پروردگار! میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے بازوؤں میں سونا چاہتی ہوں۔ میرے اس لامحدود انتظار کو اب ختم کر دے کہ مجھ میں ضبط کا یارا نہیں رہا۔"

اور بس وہ لمحہ قبولیت کا تھا۔

خادماؤں نے اطلاع دی کہ "محاذ سے ایلچی آئے ہیں۔ قدم بوسی کی اجازت چاہتے ہیں۔ چترال کی فتح کی نوید اپنی زبان سے آپ کو سنانا چاہتے ہیں۔"

اور پیغامبر حاضر خدمت ہوئے۔ ملکہ گل خاتون پردوں کے پیچھے ان کی آوازیں سنتی تھی۔ دل کی دھڑکنیں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ بتا رہے تھے۔

"قابلِ تعظیم رگیالفو! چترال کو زیر کرنا صرف علی شیر خان انچن جیسے دلیر اور جری رگیالفو کے ہاتھوں ہی ممکن تھا۔ ہم ان مناظر کی منظر کشی سے قاصر ہیں جو فتح کی یاد میں وہاں منعقد ہوئے۔

پولو گراؤنڈ میں چھوغو پراسول کی بارہ دھنیں بجیں۔ شہزادے گھوڑوں سے چھلانگیں لگاتے ہوئے گراؤنڈ میں اُترے اور انہوں نے رقص کیا۔ ڈیانگ والے نے ایسا ڈیانگ بجایا کہ مقامی آبادی بھی سر دھنتی رہ گئی۔"

اور جب اس نے یہ جانا کہ رگیالفو کا لشکر واپسی کے لیے چل پڑا ہے۔ اس کا دل فضا میں اُڑتے پرندے کی مانند چہچہایا۔

سارا سکردو استقبال کے لیے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ مینددق کھر جگمگاتا تھا، اور مینددق کھر کی رگیالمو بھی آنکھوں میں شوق اور وارفتگی کے دیئے جلائے، ہونٹوں پر مسکراہٹوں

کی کلیاں سجائے مجسم انتظار بنی بیٹھی تھی۔

وہ دوپہر معمول سے زیادہ روشن اور حسین نظر آتی تھی۔ سازندوں نے ''شادیاں'' جشن بجانی شروع کر دی تھی کہ فاتح اپنے لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے گنگو پی نہر کو دیکھا اس نہر سے متاثر شاداب سکر دو پر گہری نظر ڈالی۔ معتمد درباریوں کے ساتھ قلعے کے نئے راستے کا معائنہ کیا، باغ دیکھا اور پھر مینڈوق کھر داخل ہوا۔

امراء وزراء جرنیل اور درباری بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ مغل اور تبتی طرز تعمیر کے اس عالیشان محل کو اوپر نیچے دائیں بائیں سے دیکھتا وہ آگے بڑھتا چلا آیا۔ حتیٰ کہ وہاں آ کر رک گیا جہاں مینڈوق رگیالمو سولہ سنگار کئے اس کے استقبال کے لیے چشم براہ تھی۔ ملکہ کے ہونٹوں اور آنکھوں سے چھنتی خوشی کی چاندنی اس پر برسنے لگی اور وہ اس میں نہاتا ہوا آگے بڑھا۔ پھر اس کے شانے اس کے فولادی ہاتھوں تلے آ گئے۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکا اور یوں گویا ہوا۔

''گنگو پی نہر بنانے پر تم انعام کی مستحق ہو۔ میں انعام نہیں دوں گا۔''

''کھر پوچو قلعے کے لیے جو راستہ بنایا ہے، اس کے لیے سزا کی حق دار ہو۔ پر میں سزا نہیں دوں گا۔''

جیسے فضاؤں میں قلانچیں بھرتی لمبی کبوتری کے دل پر کسی شکاری کا کوئی تیر لگ جائے اور پل جھپکتے میں وہ پھڑ پھڑا کر زمین پر گر جائے۔

بس تو ایسا ہی اس وقت ہوا۔

اور اس نے ان فولادی بانہوں میں بس صرف ایک بار آنکھیں کھولیں اور پھر ہمیشہ کے لیے موند لیں۔



کوئی دروازے پر کھڑا تھا۔ فوجی کٹ بالوں والا نوعمر لڑکا جس کے رخسار صحت کی لالی سے دہکتے تھے اور جس کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمکتی تھیں۔ وہ کمرے میں بیٹھی سیماں کی بیٹی شبیہ کا فراک کاڑھ رہی تھی۔

عین اسی وقت سیماں ساتھ والے کمرے سے نکل کر چیخی۔

''ارے طاہر! تم کب آئے، اور ہاں آگے آؤ نا۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟''

''یہ طاہر ہے۔'' وہ متعارف کرواتے ہوئے بولی۔ ''ان کی امی بڑے بھیا کی بہن بنی ہوئی ہیں۔ ان کے دادا کشمیر سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ بلتستان کے تمدن پر ایرانیوں کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کا بھی بہت اثر ہے۔''

طاہر معصومانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

''میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ ایک تو کل دس اسد ہے۔ دوسرے ہمارے ہاں ایک آسٹریلیئن جوڑا مسٹر شاور اور مسز کیتھی شاور ٹھہرا ہے۔ وہ دونوں کوہ پیما ہیں اور کے۔ ٹو پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

وہ ہنس پڑی ''چلو یہ تم نے اچھا کیا جو مجھے لینے آ گئے۔''

واقعہ کربلا کے موسم کی مناسبت سے بلتستان میں شمسی حساب سے ماہ اسد کا پہلا عشرہ شہدائے کربلا کی یاد میں مجالس عزا کے لیے مخصوص ہے۔ یوں تو یکم اسد سے ہی سارے سکردو میں، عزاداری اور سوز خوانی کی مجالس جاری تھیں۔

اس نے سیاہ چادر اوڑھی اور طاہر کے ساتھ چل پڑی۔ طاہر کا گھر سکمیدان میں تھا خوبانیاں، توت، اخروٹ، بادام اور سیبوں کے درختوں کے پتوں اور پھلوں کو پہچانتی وہ گلیوں میں چلتی گئی۔ لوگ ماتمی لباس میں گھوم پھر رہے تھے۔ مختلف گھروں سے دُرود و صلوٰات پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سوز خوانی کی محفلیں اپنے عروج پر تھیں۔

طاہر کا گھر چوب کاری کے کام کا خوبصورت نمونہ تھا۔ کشادہ اور روشن کمروں میں دریاں بچھی تھیں۔ گھر کے پچھلی طرف زمین کا وسیع قطعہ جس میں مختلف پھلدار درخت آن بان سے کھڑے تھے۔ انگوروں کی بیلیں دیواروں تک چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں ابھی چنے کے دانے جتنا پھل آیا تھا۔ ایک طرف چارے کا کھیت تھا، اور دوسری طرف سبزیوں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ سارا گل وگلزار طاہر کی حسین والدہ کے خوب صورت ہاتھوں کا مرہونِ منت تھا۔

گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ ہی پہاڑ عمودی صورت میں کھڑے تھے اور اندر نشست گاہ میں قالین پر پھسکڑا مارے مسز کیتھی شاور اور مسٹر شاور یوں سر نہوڑائے بیٹھے تھے جیسے چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں لُٹ لُٹا گئے ہوں یا کسی عزیز کو سپردِ خاک کر کے آئے ہوں۔

باہر گلی میں دیگوں، کڑچھوں اور لوگوں کی باتوں کا شور تھا۔

وہ کیتھی کے عین سامنے دو زانو ہو کر یوں بیٹھی کہ کیتھی کی کھڑی ناک اور کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں، اس کی منی سی ناک اور بھوری سی آنکھوں سے ٹکرائیں اور دونوں کے ہونٹ مسکراہٹوں کی بارش میں نہا گئے۔

اور واقعہ یہ تھا کہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر نیوزی لینڈ کے ایک منچلے نے اس جوڑے سے کہیں یہ کہہ دیا۔

''زمین پر اگر جنت کو دیکھنا چاہتے ہو تو شنگریلا میں ایک دو راتیں ضرور گزار لینا وہ دو راتیں زندگی بھر کی آسائشوں کا نعم البدل ہوں گی۔''

اور کیتھی سکردو ایئرپورٹ پر ہی مچل گئی کہ وہ شنگریلا ہر قیمت پر جائے گی۔ لیکن وہاں پر

ایک رات اور آدھے دن کے قیام کے بعد سامان وہیں چھوڑ کر کسی سستے سے ہوٹل کی تلاش میں نکلے۔ چشمہ بازار میں ماڈرن سٹیشنری مارٹ کی دکان پر طاہر اس کا ماموں عباس کاظمی اور روزی خان باتیں کرتے تھے۔ طاہر کو بے چاروں پر ترس آ گیا، اور وہ انہیں گھر لے آیا۔ ماں نے کہا بھی۔

" عجیب ہو تم بھی۔ ایک تو عشرہ اسد کی مذہبی تقریبات اوپر سے تم غیر مسلموں کو ہانکے لئے آتے ہو۔"

اور اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ '' چھوڑو بھی ماں، خیر صلا سب چلتا ہے۔ ''

اب وہ عباس کاظمی کی سوزوکی وین میں شنگریلا سے سامان لانے کے لیے چلے گئے۔ طاہر رات کے خیراتی کھانے کے اہتمام میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ البتہ ان کے ساتھ رہی کہ چلو میں بھی جنت کی سیر کر آتی ہوں۔ اگلے جہان کی جنت تو شاید نصیبوں میں نہ ہو۔ ''

ڈرائیور چھوکرا بہت تیز گاڑی چلاتا تھا۔ ایئرپورٹ سے آگے سڑک دریائے سندھ کے ساتھ شروع ہوگئی۔ کچورہ سکردو سے کوئی بتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں گندم پکی کھڑی تھی۔ ابھی کٹائی شروع نہیں ہوئی تھی۔

گلگت سکردو روڈ پیچھے رہ گئی تھی۔ چند موڑ اور کٹے تھے۔ اب وہ وہاں آ کر رُکے تھے جسے دنیا میں جنت کا نام دیا گیا تھا۔

یہاں جھیل کے کنارے گھوڑا ایسے سرخ چھتوں والے نئے نویلے کاٹیج یوں سجے بنے کھڑے تھے جیسے نوخیز لڑکیوں پر زوردار جوانی آئی ہو۔ جھیل کے سبز پانی میں بجرے اور کشتیاں چلتی تھیں ان کشتیوں میں نئے نویلے جوڑے جن کے قہقہے پل بھر کو روکنے مشکل تھے، سیر کرتے تھے۔ پانی میں ٹراؤٹ مچھلیاں ناچتی پھدکتی پھرتی تھیں۔ اس نے کیتھی اور شاور سے کہا تھا کہ وہ واجبات وغیرہ کی ادائیگی سے فارغ ہو کر سوزوکی کے پاس آ جائیں وہ وہیں ہوگی۔

وہ اس وقت تنہائی چاہتی تھی، کیوں؟ اس کیوں کا جواب اس کے پاس تھا پر وہ یہ جواب اپنے آپ کو بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔

پھر جہاں لتی کے پھول ہنستے تھے وہیں وہ بیٹھ گئی۔ سارے جوڑے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بس زبیر اور وہ ہی رہ گئے تھے۔ پر یہ یاد کیسلے تمبا کو کے کش جیسی تھی جس نے گلے میں اُچھو لگا دیا تھا۔

چیری کا پھل سے لدا درخت اس کے سر پر تمکنت سے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے، ایک نظر درخت پر ڈالی، دوسری نظر زمین پر اور تیسری نظر سامنے پہاڑوں پر جہاں ابرق چمکتی تھی، اور پھر اس نے خود سے کہا۔

''چلو، جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ ایک دو سال بعد بھی تو اسی صورت نے جنم لینا تھا جینا ہی ہے نا۔''

پھر وہ اُٹھی۔ پژمردگی اور دل گرفتگی جو ایکا ایکی اس پر سوار ہو گئی تھی، اس نے یوں جھاڑی جیسے کپڑوں پر پڑی گرد اور مٹی کو جھاڑا جاتا ہے۔

چیری کے سرخ پھل نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ خوبانی، آلو چہ اور آلو بخارا کے درخت پھلوں سے جھکے ہوئے تھے۔ لیکن جا بجا ''DO NOT TOUCH THE FRUIT'' کی تختیاں لگا کر انہیں اشجار ممنوعہ بنا دیا گیا تھا۔

سامنے ہی وہ ORIENT SKY LINER کھڑا تھا۔ ہاتھی زندہ لاکھ کا اور مر کر سوا لاکھ والی بات تھی۔ پاک بھارت جنگ کا گرا ہوا یہ جہاز، جس کی اعلیٰ پوشش نے اسے عروسی جوڑوں کے ماہ عسل منانے کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ یہاں ایک وقت میں تین جوڑے رہنے کا لطف اُٹھا سکتے تھے۔ جہاز کی سرخ سیڑھیاں اوپر چڑھنے کی دعوت دیتی تھیں۔ لیکن وہ اسے قبول کرنے سے قاصر تھی۔ سو مجبوریاں تھی۔ بس وہاں کھڑی خالی نظروں سے کام لیتی رہی۔ سکائی لائنر کے پاس ہی رنگ رنگیلی کرسیوں پر ملکی اور غیر ملکی لوگ بیٹھے گپیں لگاتے

اور چائے پیتے تھے۔

سیب ابھی بلوغت میں داخل ہو رہے تھے۔ پر اٹھان اس غضب کی تھی کہ اس نے بے اختیار سوچا کہ عالم شباب میں پہنچ کر کیا غضب ڈھائیں گے۔ انگوروں کے گچھے اور آڑو ابھی پکنے کے مرحلے سے کافی دور لگتے تھے۔ جھیل کے اندر گچوڑا ریسٹورنٹ میں کھانے کا اہتمام ہوتا تھا۔ دروازہ بند تھا اور اس پر لگی پیتل کی تختی پر صبح دوپہر اور شام کے کھانے کے اوقات درج تھے۔ اس نے دو پل وہاں ٹھہر کر تصور میں ان نظاروں سے محظوظ ہوتے ہوئے کھانے کا لطف اُٹھایا اور روک لاؤنج میں داخل ہوگئی۔ یہاں ایک دیوہیکل پتھر کو شیشے کی دیواروں میں مقید کیا ہوا تھا۔ اس کی چوٹی پر ابرق چمکتی تھی اور چشمے پھوٹتے تھے۔ فرش پر مارخور بکرے کی کھال بچھی ہوئی تھی، اور دیوار پر حنوط شدہ ریچھ کا سر اور دھڑ لٹکا ہوا دعوت خوف دیتا تھا۔

پھر اس نے روک لاؤنج سے باہر نکل کر جھولا جھولنے میں دل بہلایا۔ دو کچے سیب توڑ کر کھائے۔ ادھر اُدھر گھومی اور گھومتے گھومتے جب اسے یاد آیا کہ کیتھی اور شاد رشاید اس کی راہ دیکھتے ہوں گے۔ تب وہ بھاگی اور واقعی وہ اپنا سامان سوزوکی میں لادے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ بولی۔

"اب آئے ہیں، چلو نا کچورہ جھیل بھی دیکھتے چلیں۔"

دونوں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

کچورہ جھیل خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ یہ سدپارہ جھیل سے چھوٹی اور کم گہری ہے۔ کناروں پر اُگی سبز گھاس میں جھیل کا ہلکورے لیتا سبز پانی کسی نازنین کی آنکھوں میں انگڑائیاں لیتے خوابوں کی مانند تھا۔ جھیل کے کنارے پی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی کا بنا ہوا ایک ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔

اس وقت شام ہو رہی تھی اور جھیل کے کنارے پر صرف ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ لڑکی شکل و

صورت اور لباس سے سو فیصد پاکستانی اور لڑکا اسی ڈھب سے سو فیصد غیر ملکی نظر آتا تھا۔ اس نے بہتیرا چاہا کہ دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے زریں اصول پر کاربند رہے۔ پر کبھی کبھی اندر کی کمینگی نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ تب بھی یہی ہوا۔ قریب جا کر پوچھ ہی بیٹھی اور سر کے عین بیچوں بیچ خالصہ سٹائل والے جوڑے والی نے اسے تیکھی نظروں سے گھور کر کہا۔

''میں تو پاکستانی ہوں اور یہ آسٹریا سے ہے۔ کلاس فیلو ہیں ہم دونوں۔''

اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا کیتھی اور شاور لڑکے سے باتیں کرنے لگے۔ پر ان دونوں کو بھی جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ اپنی تنہائی میں مداخلت کرنے والوں کو کچھ اچھا نہیں سمجھ رہے ہیں۔ تینوں واپسی کے لیے چلے۔ اس کا جی ریسٹ ہاؤس کے کنارے بیٹھ کر چائے کا ایک کپ پینے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن اس وقت تو اس کے پاس پائی بھی نہیں تھی۔

اور یہ بھی بس حسن اتفاق ہی تھا کہ جب وہ ابھی ایک ڈیڑھ فرلانگ چلے ہوں گے، اس نے روح اللہ کی جیپ دیکھی۔ وہ یقیناً اس وقت ڈیوٹی پر کچورہ میں اس پاور ہاؤس کا معائنہ کرنے آیا ہوگا۔ جو کچورہ گاؤں اور شنگریلا ریسٹورنٹ کو بجلی سپلائی کرتا ہے۔

وہ ہنسا اور کھڑکی میں سے سر نکال کر بولا۔

''تو آپ یہاں پہنچی ہوئی ہیں۔''

وہ بھی ہنسی اور بولی۔

''تم تو فرشتے کی طرح مدد کے لیے آگئے ہو۔ مجھے کہیں سے چائے پلاؤ۔ سر پھٹا جا رہا ہے۔''

اور اس نے بلتی زبان میں ڈرائیور چھوکرے سے کچھ کہا۔

پھر آگے پیچھے دونوں جیپیں پاور ہاؤس پر آگئیں۔ مشینیں زور شور سے کام میں مصروف تھیں۔ اوپر کوہل سے پانی شرائے مارتا نیچے آ رہا تھا۔ نیچے کچورہ کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ ملازم لڑکا چائے بنانے لگا تھا۔

روح اللہ اندر پاور ہاؤس میں چلا گیا۔کیتھی اور شادر بھی مشینوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگے۔بس وہ وہاں بیٹھی پہاڑوں اور کچورہ کے جنگل کو دیکھتی رہی۔درختوں پر عنبری سیب لٹک رہے تھے۔

''کچورہ کے عنبری سیب ذائقے ،خوشبو،رنگت اور سائز کے اعتبار سے پوری دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔''

روح اللہ اس کے قریب آ کر بولا۔

''چھوڑو روح اللہ مت بتاؤ مجھے یہ سب۔میرے لیے تو ابھی انگور کھٹے ہیں۔''

واپسی پر آتے آتے روح اللہ انہیں فرق ژھو جھیل بھی دکھانے لے گیا۔یہ بھی کچورہ کے علاقے میں ہی تھی۔اس کے تین طرف پہاڑ اور ایک طرف قدرتی طور پر بند بندھا ہوا ہے۔لیکن اس جھیل کے پانی سے علاقے کے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ یہ آبادی کی سطح سے کافی نیچے واقع ہے۔یوں یہ جھیل ایک خوبصورت تفریح گاہ ضرور ہے۔



لمبے چوڑے غائبانہ تعارف کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بس دو جملے ہی کافی تھے۔

ایک تو یہ کہ گھر والی سے بچہ نہ ہونے کے باوجود پیار نہیں عشق کرتا ہے، اور دوسرا ایسا جیالا ایسا شہ زور اور ایسا دلیر تھا کہ ڈوگرہ راج کے خلاف سرکشی پر اُتر آیا تھا۔ کھلے عام بغاوت کر کے سکردو بھاگ آیا اور بلتستان کی جنگ آزادی میں جی جان سے لڑا۔

پر سیماں تھی کہ بولے چلی جا رہی تھی سکسہ چھور بٹ میں دادی جواری کا ہمسایہ ہے۔ مگر عزیزوں سے بڑھ کر ہے۔ بچوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ لڑ لگنے والی کی گود خالی ہونے کے باوجود دوسرا بیاہ نہیں رچایا۔

''سیماں میری جان اس سلور گرے بالوں والے معمر مرد کے لیے جو ابھی رات سکسہ سے آیا ہے اور اس وقت تمہاری نشست گاہ میں بیٹھا دادی جواری اور ڈاکٹر سیف اللہ سے باتیں کرتا ہے، اس کے لیے بھلا تم کیوں ہلکان ہوئی جاتی ہو۔ بندہ تو اپنے منہ سے آپ بولتا ہے۔ آؤ چلو! ناشتہ کریں۔ مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''

اس نے سیماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچن کی طرف گھسیٹ لیا تھا، اور جب وہ کھا پی کر فارغ ہوگئی۔ تب اُٹھی اور نشست گاہ میں اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ تعارف شاید دادی جواری پہلے ہی کروا بیٹھی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے محبت بھرا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تھا، اور شفقت بھری آواز میں بولا تھا۔

''میں پنجاب کے مشہور شہر سیالکوٹ میں چار سال رہا ہوں۔ اس وقت جب ابھی

پاکستان نہیں بنا تھا۔''

'' کچھ اس دور کی باتیں سنائیے نا جب بلتستان پر ڈوگرہ راج تھا۔ جب اس نے اپنی جنگ آزادی لڑی۔''

وہ ہنس پڑا ہنسنے میں اس کے دانت نمایاں ہوئے تھے۔ جو اس عمر میں بھی موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔

'' میں نہیں جانتا میری بچی! کہ تم اس امر سے آگاہ ہو یا لاعلم کہ بلتستان کے غیور عوام نے بغیر کسی فوجی تربیت کے، بغیر سامان حرب کے اور بغیر کسی بیرونی امداد کے صرف اور صرف اپنے جذبہ ایمانی پر ڈوگرہ فوج سے آزادی حاصل کی۔ ان کے کارنامے ان سینکڑوں محیر العقل شجاعت کے کارناموں سے کسی طرح کم نہیں، جو تم نے تاریخی کتابوں میں پڑھے ہوں گے۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ یہ کارنامے بلند و بالا پہاڑوں کی اوٹ میں انجام دیئے گئے اور انہیں پبلسٹی نہیں ملی۔ میری بچی! شاید تمہیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ یہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم لوگوں نے صرف اسلام سے محبت کی بناء پر غیر مشروط طور پر پاکستان کی مملکت میں شمولیت کی۔''

اس نے صوفے کی ہیٹ پر پھیلا اس کا بوڑھا ہاتھ جس کی پھولی رگیں گھنے بالوں میں چھپ سی گئی تھیں، اپنے ہاتھوں میں تھاما، اسے چوما اور کہا۔

''ان جذبوں کو ہمارا سلام ہے۔''

اور اس نے محبت و شفقت سے اس کا سر تھپتھپایا اور بولا۔

'' میں گنگو پی محلہ میں راجہ صاحب کے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ تم اگر میرے ساتھ چلو تو میں تمہیں وہ جگہ دکھاؤں گا۔ جہاں سے قلعہ کھر پوچو تک پہنچنے کے لیے سرنگ کھودی گئی تھی۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ اندھے کو کیا چاہیے تھا، دو آنکھیں۔

جوتے پہن کر غلام حیدر کے ساتھ باہر نکلنے لگی تو سیماں عقب سے چلائی۔

''کمبخت! میں تیرے لیے مرغی روسٹ کرنے والی تھی اور تو بھاگی جا رہی ہے۔ عجیب پھراوندو ہے تو بھی۔''

اور اس نے شوخی سے سیماں کو گھورتے ہوئے رک کر کہا۔

''میرا حصہ اپنے نئے وارد ہونے والے منّے کو کھلانا۔''

گنگو پی نہر کو دیکھ کر اسے سیماں کی بات یاد آئی کہ منوں وزنی پتھر اُٹھانے والے لوگ نکمے اور نااہل تھے، تو اہل لوگ کیسے ہوں گے؟

راجہ سکردو کا پرانا محل گو ابھی کھنڈر نہیں بنا تھا پر پندرہ بیس برسوں میں کھنڈر بننے کی سو فیصد توقع ہے۔ نئی عمارت کے سامنے درخت کی گھنی چھاؤں تلے راجہ سکردو کھڑا تھا۔ یوں جیسے سورج دیوتا کھڑا ہو۔ اردو کے شعراء نے انسانی حسن و خوب صورتی سے متعلق ساری تشبیہیں اور استعارے صرف صنف نازک کے لیے ہی مخصوص کر دیے ہیں اور صنف طاقت ور کو صرف وجیہہ پر ہی ٹرخایا جاتا ہے۔

پر اس وقت اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ حسن اور جوانی کے اس مجسّمے کو کیا نام دے جو درخت کے نیچے کھڑا الشکارے مارتا تھا۔

غلام حیدر نے مصافحہ کیا۔ احوال پرسی کی۔ اس کا تعارف کروایا اور چائے کی پیش کش سے معذرت کرتے ہوئے دائیں طرف مڑ گیا۔ پھر ایک جگہ رکا اور بولا۔

یہ ہے وہ تاریخی جگہ جہاں سے سرنگ کھودی گئی۔

پھر غلام حیدر ایک صاف ستھری جگہ پر اخروٹ کے پھیلے ہوئے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی پاس ہی پڑے ایک چھوٹے سے پتھر پر ٹک گئی۔

''دراصل جب برصغیر میں مسلمان پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس وقت جموں میں میجر محمد دین، کیپٹن حسن (مرحوم کرنل مرزا حسن) میجر احسان علی اور مہاراجہ کی فوج کے بعض مسلمان افسروں نے ایک خفیہ میٹنگ میں طے کیا تھا کہ وہ جہاں جہاں تعینات ہو

جائیں وہاں کا مسلح بغاوت کے ذریعے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا جائے گا۔

اسی وقت محمد یوسف وہاں سے گزرا، غلام حیدر کو بیٹھے دیکھ کر حیرت زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوشی سے بھی چلایا۔

''کمال ہے یہاں بیٹھے ہیں۔''

''میرے دوست کا بیٹا ہے اور ان دنوں کی پیداوار ہے جب سکردو میں مارٹر، مشین گن، برین گن اور رائفلوں کی آوازوں کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ ذہین نوجوان اب کتابیں لکھتا ہے۔''

محمد یوسف حمید گڑھ جا رہا تھا۔ وہ انہیں بھی اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گیا۔

ایک بڑی سی عمارت کے پاس پہنچ کر محمد یوسف بولا۔ ''یہاں وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) لالہ امرناتھ کو گولی مار کر جہنم رسید کیا گیا تھا۔ بڑی دلچسپ تفصیل ہے۔ اس وقت منصوبے کے مطابق مجاہدین نے چھاؤنی میں فائرنگ شروع کر دی تھی۔ جمعدار رحیم داد اپنی پلاٹون کے ساتھ حمید گڑھ کی طرف روانہ ہوا کہ خزانے کی کنڈیاں توڑ کر رقوم سکمید ان پہنچائی جائیں۔ خزانے کو توڑ لیا گیا۔ جب دفعتاً وزیر وزارت لالہ امرناتھ اپنی رہائش گاہ سے خزانے کی طرف آیا۔ اس وقت سپاہی سرفراز خان خزانے کے سامنے دروازے پر پہرہ دیتا تھا۔ امرناتھ نے پوچھا ''یہ نیچے چھاؤنی کی طرف سے فائرنگ کی آواز کیسی آ رہی ہے؟ سرفراز خان نے نہایت ہوشیاری سے فی الفور جواب دیا۔

''صاحب کل شام جو نئی نفری کرگل سے پہنچی ہے، وہ اپنے ہتھیاروں کی صفائی کے بعد انہیں ٹیسٹ کر رہی ہے۔''

امرناتھ بحث پر اُتر آیا تھا۔ سرفراز خان جواب پر جواب دیئے جا رہا تھا۔ جب اچانک اسے شک گزرا۔ اس نے پستول نکالا۔ فائرنگ کرنے ہی لگا تھا۔ جب سرفراز خان پیچھے کی طرف جھپٹا اور اسے گردن سے دبوچ کر گھسیٹا ہوا اسٹرانگ روم میں لے گیا۔ اسی کے

پستول سے پل بھر میں اس کا کام تمام کر دیا۔

حمید گڑھ میں محمد یوسف کی بہن کے گھر کھانا کھاتے ہوئے، غلام حیدر نے کہا۔

''میری بیٹی! میں تمہیں اس بلتستان کی ایک جھلک ضرور دکھاؤں گا، جو ڈوگرہ راج میں تھا۔''



حماقت تھی اس کی جب مرچھا آ نا ہی تھا تو زخ (مشکوں اور لکڑی کے ڈنڈوں سے بنی ہوئی کشتی) میں آ جاتا۔ اب بلچو کزم (توت کے درختوں کی جڑوں کے چھلکے سے بنی ہوئی رسیوں کا پُل) کے رسے پر چلتے ہوئے آدمی پریشان کن سوچوں میں گھرا ہو تو نیچے دریائے شیوق کے یخ پانیوں میں گرتے کیا دیر لگتی ہے ان دنوں سلتورہ کی برفانی چوٹیوں سے یخ نالوں میں بہنے لگی تھی اور شیوق کا پاٹ چوڑا ہو رہا تھا۔

وادی سکسہ کا غلام حیدر تین سال قبل کشمیر کے راستے مغربی پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں مزدوری کرنے آیا ہوا تھا۔ گو کہ برِصغیر کے حالات مخدوش تھے۔ محنت مزدوری میں پیسہ کم تھا۔ پھر بھی اس نے جی جان سے محنت کی۔ ان دنوں سیالکوٹ کے پاکستان میں شامل ہونے کا بھی شور تھا۔ مسلمان ہونے کے ناطے اس کی ساری ہمدردیاں اس نئے دیس کے ساتھ تھیں۔ جب وہ دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد سونے کے لیے لیٹتا تو ایک سوال اپنے آپ سے ضرور کرتا۔

’’کیا میرا بلتستان پاکستان میں شامل ہو سکے گا یا اللہ! میرے بلتستان کو بھی ڈوگرہ غلامی سے نجات دے۔‘‘

یہ دعائیہ جملے کہہ کر وہ فی الفور اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

ان تین چار سالوں میں اسے کل پانچ خط ملے۔ پہلے خط میں اس کی اکلوتی بہن کی بیوگی کی اطلاع تھی۔ اس کے باپ نے لکھا تھا زینب کو ان لوگوں نے میکے بھیج دیا ہے۔ اس کے

خاوند نے اس کے لیے کوئی وصیت ہی نہیں لکھی تھی۔

دوسرے سال دوسرے خط میں سلتورہ گلیشیئر کے تودے ٹوٹ کر شیوق میں گرنے سے ان کے کھیت اور وادی کا کچھ حصہ بہہ جانے کی خبر تھی۔ اس نے یہ لکھا تھا میرا خیال تھا میں اس بار کنگنی، ترمبہ اور چینا بوؤں گا۔ زینب نے میرا ارادہ جان کر کہا بھی۔

چھوڑو ابا! کنگنی اور ترمبہ کو کیا بوتے ہو۔ ایسی بدذائقہ روٹی ہوتی ہے۔ ان کی۔'' پر میں تو ڈھیر سارا اناج اُگانے کے منصوبوں میں غرق تھا۔ بیج بھی ڈال دیا تھا پر نہیں جانتا تھا کہ یہ پانچ کھیت بہہ جائیں گے۔ پر بچے یہ نقصان تو ہوا۔ اب تمہیں اس کے متعلق کیا لکھوں کہ اوپر والے وہ چار کھیت جسے تم نے اور میں نے جان مار کر آباد کیا تھا اور ان کے انتقال کے لیے پٹواری کو بھی رپورٹ کر رکھی تھی۔ پر اس کی حرامزدگی تو دیکھو، اس نے اعتراض لگا دیا کہ زمین کو نوتوڑ کیے جانے سے پہلے اجازت کیوں نہیں لی۔ زمینی انتقال کی ساری تاریخ میں ایسے اعتراض کی ایک مثال نہیں ملتی۔ پر بچے انہیں کون کہے۔ ستم یہ کہ نقد مالیہ اور جنس لگان بھی ہمارے ذمہ لگا دی۔

اوپر سے راجہ کے خدمتگار اپنا لگان وصول کرنے آ گئے۔ ابھی ان مصائب سے کمر سیدھی نہ کرنے پایا تھا کہ گنگ سکن (نائب نمبردار) کا پیغام آیا کہ تحصیلدار (نائب وزیر) شدا خ سے آتا ہے۔''پیون'' پڑاؤ پر جانا ہے حکم حاکم مرگ مفاجات والا معاملہ تھا سمجھ نہیں آتی تھی، کہ تھب ستد (باورچی کا نذرانہ) کے لیے کیا پیش کروں گا۔ بچے ''بیگار سسٹم'' بلتی قوم کے خیف و نزار جسم پر وہ جونک بن کر چمٹ گئی ہے جو اس کا رہا سہا خون پی پی کر کپا ہوئی جاتی ہے۔

ہاں علی حسین کے کھیت بھی بہہ گئے ہیں۔ وہ بھی میری طرح پریشانیوں کی چکی میں پس رہا ہے۔ بلکہ یہ کہوں کہ پچاس کے پچاس کرائے کے ٹٹو ایسی ہی مجبوریوں سے دوچار تھے، غلط نہیں۔ بس تو اس دن میں نے سوچا کہ میں ہل چنگرا (چوپال جا کر کہے دیتا ہوں کہ یا تو مجھے آدھا کمل (۲ من ۲۰ سیر یعنی ۱۰ ٹوپے) دیں کہ میرے تھب ستد (باورچی کا نذرانہ) کے

بندوبست ہو سکے یا پھر میرا نام کاٹ دیا جائے۔ جب میں نے بل چنگرا (چوپال) اس کا اعلان کیا۔ سرپنچ مجھے کھانے کو دوڑا۔

میں نے گائے کھونٹے سے باندھی اور پڑاؤ پر پہنچا۔ اس دن شام بہت جلدی ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ گھر میں زینب اس کے بچوں اور تمہاری ماں کے لیے گندم یا چاول یا ترمبہ کا ایک ٹوپہ تک نہ تھا۔ صبح زینب نے بچوں کو خشک خوبانیوں کا رس پلایا۔ تو انہوں نے کہا۔

''ماں تم اب کتنے دن ہمیں یہی پلاتی رہوگی۔'' اور زینب نے پلو سے آنکھیں پونچھ کر کہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جو نصیب میں ہے بھگتنا ہوگا۔''

بس ایک بکری تھی جو دودھ دیتی تھی چاہے وہ اس کا دودھ پئیں اور چاہے اس کا گوشت کھائیں۔ اب یہ ان کی مرضی تھی۔ مجھے تو چالیس دن پڑاؤ پر رہنا تھا۔

یہ گوتب (کاشت کا پہلا وقت) کے دن تھے، اور میں گھر سے غائب ہو رہا تھا۔ تم شاید میرے جذبات کا اندازہ نہ لگا سکو۔ کتنا یاد آئے تھے تم مجھے۔''

میں نے پڑاؤ پر پہنچ کر گنگ سکن (نائب نمبردار) کو بتایا کہ میرے پاس خشک حسب ستد (باورچی کا نذرانہ) نہیں ہے۔ اس نے زوردار لات میرے کولہے پر ماری اور ناک چڑھا کر بولا۔

''نہیں ہے تو میں کیا تیری بوٹیاں انہیں کھلاؤں گا۔''

نوٹ:۔

بلتستان کے طول و عرض میں ہر پڑاؤ پر اُسی کے گرد و نواح کے دیہاتوں میں سے پچاس قلی اور پانچ گھوڑے ہمہ وقت حاضر رکھے جاتے تھے۔ یہ سرکاری مہمانوں کے لیے تھا۔ کہ ایک پڑاؤ سے انہیں دوسرے پڑاؤ تک پہنچایا جائے۔ ہر گھرانے کو سال میں چالیس روز تک پڑاؤ پر ''بیگار'' کی ڈیوٹی دینی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے کھانے پینے کا اہتمام بھی اپنی گرہ سے کرنا پڑتا تھا۔

اور اس نے پھر کارندوں کو حکم دیا کہ میرے گھر جا کر گائے کھول لائیں اور وہ اکلوتی گائے جس میں میری جان پھنسی ہوئی تھی، وہ لوگ لے گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کا سودا ہوا اور وہ اونے پونے بکی تحصیل دار کی بارہ من پکے بوجھ والی بیوی، اس کے موٹے موٹے بچے اور دو کتے پالکیوں میں بیٹھے اُٹھائے نہیں جاتے تھے۔ لگتا تھا جیسے پالکیاں ان کے بوجھ سے ٹوٹ جائیں گی۔ غم نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ جی چاہتا تھا پالکی کسی کنکر کی مانند ہوا میں اُچھال دوں۔ جو بل کھاتی، ہوا کے دوش پر لہراتی، دریائے شیوق میں گرے اور یہ بھاری بھرکم وجود کہیں کنارے پر بتیسی نکالے پڑا ہو۔

پر بچہ تصورات کا کیا ہے۔ تصورات میں تو میں اپنے بلتستان کو اسی عروج پر دیکھتا ہوں جس پر یہ کبھی تھا۔ اس کا وہ ترقی یافتہ تہذیب و تمدن، جس پر یہ نازاں تھا۔ اس کی فوجیں جو یلغار کرتی ہوئی تبت اصلی سے کوہ ہندوکش کے پار تک چلی گئی تھیں۔ یہ میرا بلتستان جس کی عظمت نے مغلیہ شاہوں کو بھی اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یوں کہ اکبر اعظم اپنے بیٹے سلیم کے لیے پہلی ملکہ کا انتخاب بلتی شاہی خاندان سے کرتا ہے۔

ارے بیٹے! میرا جی چاہتا ہے میں صور اسرافیل بن جاؤں اور ہر بلتی ماں کے کانوں میں یہ پھونک دوں کہ وہ ایک اور علی شیر خان انچن جن دے۔ صرف ایک اور علی شیر خان انچن جو اس طوق کو ہمارے گلوں سے اُتار پھینکے کہ اس نے سارے سریر میں کوڑھ پھیلا دیا ہے۔

اور جس دن غلام حیدر کو یہ خط ملا تھا وہ تکیے میں منہ دے کر بہت رویا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صبح کے روشن ستارے کی طرح سکینہ خط میں سے نکل کر اس کے سامنے نہیں بیٹھی تھی۔ وہ روتا رہا۔ پھر اس نے آنسو پونچھے اور اپنے آپ سے کہا۔

مسلمان قوم کبھی غداروں سے پاک نہیں ہوگی۔ بنگال ہو یا غرناطہ، میسور ہو یا بلتستان، اب بھلا مقپون شہزادے محمد خان اور شیر خان باہم مل کر اس قوم کی غیرت کا دیوالیہ نکالنے کے درپے نہ ہوتے تو بھلا کوئی بلتیوں کو غلامی کی زنجیریں پہنا سکتا تھا۔ ڈوگرہ وزیر زور آور سنگھ چے چے تھنگ

آ کر رُک گیا تھا۔ دریا پار کرنے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ چے چے ٹھنگ کے بالمقابل ڈگواور تھموخان میں بلتی فوج کے مورچے تھے۔ سردی زوروں پر تھی۔ شیر خان غدار نے دریا کے بیچوں بیچ بلبلیاں پھنسوائیں۔ بہہ کر آنے والے یخ کے ٹکڑے رُک گے اور ڈوگرہ فوج دندناتی سر پرپہنچ گئی۔

بس اس طرح سکردو کے کھرپو چو قلعے پر قبضہ ہوگیا۔ مقپون خاندان کے آخری بادشاہ، احمد شاہ سے اسی بدبخت شیر خان نے قسم کھا کر کہا۔ زورآور سنگھ کا اس ملک پر قبضہ جمانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ تو تمہارے بیٹے کی تم سے صلح کروانے آیا تھا۔

بس تو اتنی سی بات تھی قسم پر اعتبار کیا اور ملک گنوا بیٹھا۔

اور جب وہ اُٹھا، وہ ایک بار پھر اپنے آپ سے بولا تھا۔

''جب حاکم کمزور ہو جائیں تو غدار پیدا ہوتے ہیں اور وہ ملک کی قسمت کو محض اور محض اپنے مفاد کے لیے داؤ پر لگاتے ہیں۔''

چوتھا خط سکینہ کے بارے میں تھا۔ اس کا باپ مر گیا تھا۔

اور جب چار سال پورے ہونے میں کوئی دس دن باقی تھے، وہ ولیس آ گیا تھا۔

کل کوئی گیارہ بجے پہنچا تھا۔ بل چنگرام میں سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس نے جوش و خروش سے برصغیر کی صورت حال کے بارے میں بتایا۔

پاکستان بس انشاء اللہ ایک دو ماہ میں وجود میں آنے والا ہے۔ اس کی اس بات پر لوگوں کے چہرے خوشی سے کھل گئے تھے۔

پر اس خوشی کا چہرہ ماند پڑ گیا تھا۔ جب اُنہوں نے سکھوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں نہتے بے گناہ مسلمانوں پر ظلم وستم سنے۔

خدا انہیں غارت کرے۔ خدا مسلمانوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

ڈیڑھ بجے'' مرچھا'' کے لیے چلا۔ اسے سکینہ سے ملنے کی بہت جلدی تھی۔



پتھروں کے تین پائیدان چڑھ کر وہ انگنائی میں داخل ہوا تھا کچے آنگن کے مشرقی کونے میں بید مجنوں کی ٹہنیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ آنگنائی کے ساتھ ہی دھوئیں کی سیاہی سے لپا پتا باورچی خانہ جس کی غربی دیوار پر منجھے ہوئے سلور کے برتنوں کی چھوٹی سی قطار تھی۔ وہ اب دہلیز پر کھڑا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں بچھی چٹائی پر سکینہ کی ماں ظہر کی نماز پڑھتی تھی۔ اس نے سلام پھیرا اور دروازے میں اسے کھڑے دیکھا۔ وہ آگے بڑھا۔ جھکا دولت بی بی نے اس کا ہاتھ چوما اور اپنے پاس چٹائی پر بٹھالیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ قریبی پہاڑ پر جا رہا تھا۔ جہاں سکینہ بھیڑ بکریوں کو چرانے گئی ہوئی تھی۔ سکینہ وادی مرچھا میں صبح کے ستارے کی مانند چمکتی تھی۔ غلام حیدر اوپر جا کر بہت دیر تک ادھر اُدھر دیکھتا رہا یہاں پانی تھا۔ گندم کے بوٹوں نے سر نکال رکھے تھے۔ سبزہ پھوٹا ہوا تھا۔ سارے میں ہریالی کا راج تھا۔

بکریاں کھیتوں کی طرف آ گئی تھیں۔ جنہیں ہٹانے کے لیے سکینہ یک دم بغلی پہاڑ سے برآمد ہوئی اور اسے سامنے کھڑے پا کر مبہوت سی ہو گئی۔ وہ واقعی غلام حیدر ہے یا اس کا کوئی ہیولا۔

اور جب اس کا وہم یقین میں بدلا تب اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش سی ہنسی پیدا ہوئی۔ اس نے سر جھکایا اور انگوٹھے کے ناخنوں سے زمین کھرچتے ہوئے بولی۔

''مجھے یقین نہیں آتا یہ حقیقت ہے یا وہ خواب جو میں ہر روز دیکھتی ہوں۔''

آسمان کا سورج عین اس کے ماتھے پر چمک رہا تھا اور زمین کا سورج عین اس کی آنکھوں میں روشنیاں بکھیر رہا تھا۔

زمین کا سورج آگے بڑھا۔ اس کے شانوں پر اس نے اپنے ہاتھ رکھے اور بولا۔

''ہاں یہ میں ہوں'' تمہارا غلام حیدر کیا بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی۔''

اور جب وہ دونوں ایک جھاڑی کے پاس بیٹھ گئے تو سکینہ نے پوچھا تھا۔

''کہو کیسے رہے، نیچے کے لوگوں کا کیا حال تھا؟''

اس نے بالکل اپنے پاس پھیلی جھر چھو (کانٹے دار جھاڑی) کو بغور دیکھا اور بولا۔

''نیچے حالات خراب ہیں۔ ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں میں دنگا فساد ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنا الگ وطن پاکستان بنالیا ہے۔''

''پاکستان'' سکینہ نے کہا ''ہمیں بھی اس کا فائدہ ہوگا۔''

''فائدہ غلام حیدر نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں یوں جھانکا جیسے کوئی دانا کسی احمق کی آنکھوں میں جھانکتا ہے۔

''ہم بھی آزاد ہوں گے۔ پاکستان ہمارا بھی وطن ہوگا۔''

''ہاں تو سکینہ مجھے بتاؤ گی کہ تم نے مجھے کتنا یاد کیا۔''

اور سکینہ کی آنکھوں میں فوراً نمی اُتر آئی۔ اس نے نیلے نکھرے روشن آسمان کو دیکھا۔ چاکلیٹی پہاڑوں پر اس کی نظریں تیرتی پھریں۔ پھر وہ غلام حیدر کی طرف مڑی۔ اس کا شہابی چہرہ اور شہابی ہوگیا تھا۔ جب اس نے یہ کہا۔

''یہ بتانا کس قدر مشکل ہے مجھے لکھنا نہیں آتا تھا ورنہ تمہیں ضرور لکھتی مجھے تو گانا آتا ہے اور میں گاتی تھی یہیں ان جگہوں پر ان ہی پہاڑوں پر میری آواز گونجتی تھی یہی میرا دُکھ درد سُنتے تھے۔''

''سکینہ مجھے وہ گیت نہیں سناؤ گی؟''

چولی چن لہ گوانا منگوسے سنے یود
نی رے چی بیور چن مید پنا چولی جسیم شید
تورے خان چو

ترجمہ: میں جب خوبانی کے باغ میں گئی تو (دیکھا) بہت ساری خوبانیاں پکی ہوئی ہیں۔ میرے گبھرو کے نہ ہونے سے یہ خوبانیاں بے ذائقہ لگتی ہیں۔

اے حیدر خان!

میں جب گلاب کے باغ میں گئی تو (دیکھا) بہت سارے گلاب کھلے ہوئے ہیں میرے گبھرو کے نہ ہونے سے یہ گلاب بدرنگ لگتے ہیں۔

اے حیدر خان راجہ۔

سکینہ تم اس راجہ حیدر خان کو جانتی ہو جس کے لیے کوئی یہ گیت گاتا تھا۔

وہ ذرا سا ہنسی اور بولی۔

''کوئی ہوگا پر میں تو یہ جانتی ہوں کہ کسی نے شاید یہ گیت میرے لیے اور صرف میرے لیے اور صرف میرے لیے ہی کہا ہے۔''

اور غلام حیدر نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا سیندوری چہرہ تھاما۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

''اے کاش ایسا کوئی گیت تم میرے لیے بھی کہو اور وہ گیت تمہارے ہونٹوں سے پھسلتا لوگوں کی زبانوں پر آ جائے۔ سکینہ یہ گیت تو اس دل کی پکار تھی۔ جسے حیدر خان اماچہ راجہ شگر سے پیار تھا۔ عشق تھا۔ یہ گیت تو ایک نوحہ ہے۔ جس میں اس کی سسکیاں اور آہیں سنائی دیتی ہیں۔

حیدر خان اماچہ بلتستان کا وہ مایہ ناز بیٹا، جس پر بلتی قوم کو فخر ہے۔ اس کا دم گھٹتا تھا۔ جب وہ اپنی قوم کو ڈوگرہ غلامی میں دیکھتا تھا۔ اس کا خون کھولتا تھا کہ ہر سو غلامی کے گھٹاٹوپ اندھیروں کا راج تھا۔ اس کی محبوبہ تمہاری ہی طرح تھی۔ نوخیز کلی جو ابھی پوری طرح کھلی بھی نہ

تھی۔اسے پیار تھا حیدر خان سے۔اسے عشق تھا اس کی شہ زوری سے۔اس کی آنکھوں کے جگنوا سے دیکھ کر ٹمٹماتے تھے۔اس کے رخسار اسے اپنے سامنے پا کر دہک اُٹھتے تھے۔پر یہ کیسا پیار تھا؟ جس کی زبان نہیں تھی۔ یہ کیسی آگ تھی جس میں حرارت نہیں تھی۔

حیدر خان تو تن من دھن قوم کے لیے وقف کئے بیٹھا تھا۔اسے کہاں فرصت تھی کہ وہ دیکھتا کہ کسی کی خاموش آنکھیں اسے کوئی پیغام دیتی ہیں۔اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں صرف ایک خواب جھلملاتا تھا، جو آزادی کا تھا۔

اس کے شب و روز کاظم بیگ راجہ سکردو، علی خان راجہ روندو اور خورم خان راجہ کیریس کے ساتھ صلاح مشوروں میں گزرتے۔وہ آندھی کی طرح محل میں داخل ہوتا اور بگولا بن کر نکل جاتا۔

یہ ۱۸۴۲ء کا آغاز تھا۔جب اس نے زوردار جنگ لڑی اور غلامی کے اس طوق کو اُتار پھینکا۔درختوں پر شگوفے مسکرائے ہی تھے۔پہاڑوں کی برف نے تشکر کے آنسو بہانے شروع کئے تھے۔بلتستان کے لوگوں نے سجدہ شکر سے سر ابھی اُٹھایا ہی تھا کہ قیامت پھر ٹوٹ پڑی۔

یہ وہ دن تھے جب پوریگ اور لداخ میں بھی آزادی کی جد و جہد عروج پر تھی۔اس بار مہاراجہ گلاب سنگھ نے دیوان ہری چند کو تین ہزار فوجیوں کے ساتھ بلتستان بھیجا اور وہ، ننگ دین اور ننگ ملت شیر خان غداری کے لیے پھر تیار تھا اس غدار نے دیوسائی چور دروازوں سے فوج کو سکردو میں داخل ہونے کو کہا۔پہرے داروں نے لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔لیکن جب سیندھ لگ جائے تو دیواریں کب مضبوط رہتی ہیں۔جب گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگے تو تباہی ہی مقدر بنتی ہے۔حیدر خان قلعہ کھر پوچو میں محصور ہوا۔ان غداروں نے قلعے کے بڑے محافظ وزیر محمد علی ہلچہ فٹ پا کو لالچ دے کر قلعے کا پھاٹک کھلوا دیا۔

کیسی قیامت تھی۔ایک ایک کو پکڑ کر قتل کیا۔بس وہ بھی کہیں بھاگ نکلی۔ایک معمر عورت نے بارود خانے کو آگ لگا دی تاکہ نوخیز لڑکیاں جل مریں۔حیدر خان گرفتار ہو کر جموں

قید ہوا اور وہیں قید میں ہی فوت ہو گیا۔

اور وہ پاگلوں کا روپ دھارے قریہ قریہ گاؤں گاؤں گھومتی گاتی پھری۔ بس تو یہ گیت اسی کے دل کی پکار تھی۔

''سکینہ تم یہ گیت پھر گاؤ۔''

وہ پتھروں پر نیم دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سکینہ کی لوچدار رسیلی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں۔ اُٹھ کر بیٹھا اور بولا۔

''سکینہ اگر میں بھی بلتستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں شہید ہو جاؤں، تو تم ایسا ہی گیت میرے لیے بھی گایا کرو گی۔''

''غلام حیدر! تم شہادت کا ہی کیوں سوچتے ہو؟ کیا غازی بننا تمہارے مقدر میں نہیں۔''

اور اس نے فی الفور اپنا رخ اس کی طرف پھیرتے ہوئے اک وارفتگی سے کہا۔

''میں حیران ہوں تو اتنی خوب صورت سوچ رکھتی ہے۔''

اور پھر دونوں ریوڑ کو لے کر نیچے اُترے۔ اس نے کھانا کھایا اور واپسی کے لیے چلا، اور ابھی وہ دریائے شیوق کے کنارے پر کھڑا تھا۔ جب اسے کنگ سکن (نائب نمبردار) کے کارندے نے پیغام دیا کہ اس کے گھر کے ایک آدمی کو پڑاؤ پر جانا ہے۔ شام سے پہلے وہ حسب ستہ (باورچی کا نذرانہ) کے ساتھ پہنچ جائے۔

اور بلیچو کزم کے رسوں پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کی سوچیں پریشان کن ہونے کے ساتھ ساتھ باغیانہ بھی تھیں۔



برف پوش پہاڑوں کی وہ صبح بہت ٹھنڈی تھی۔ ہوائیں رگ رگ کو برچھی کی طرح کاٹتی تھیں۔ دراز قامت وجیہہ رعنا جوان وادی روندو کا تاجدار اپنے سرکاری امور کی بجا آوری کے لیئے ''گانچھی'' آیا ہوا تھا۔ اس وقت آگ کی طرح دہکتی بخاری نے پورے کمرے میں حرارت پھیلا رکھی تھی۔ وہ نمکین چائے کا پیالہ لبوں سے لگاتا، گھونٹ بھرتا اور قالین پر رکھی چھوٹی میز پر پڑی فائل پر نظریں جمادیتا۔ اس فائل میں وہ کاغذات تھے جو مہاراجہ کشمیر کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ جن میں راجاؤں کے لیے پرانی مراعات کے علاوہ نئی مزید اور پُرکشش مراعات کا اعلان تھا۔

ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ آداب بجالاتے ہوئے بولا۔

''جناب: حراموش کا ایک نوجوان آیا ہے۔ بولتا ہے اسے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔''

محمد علی خان نے فائل بند کی۔ پیالہ خالی کیا اور بولا۔

''بھیجو!''

ایک نوجوان اندر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنے والے کی آنکھوں میں چیتے جیسی چمک تھی۔ اس کا کرخت بارعب چہرہ اس کے فولادی عزم کو ظاہر کرتا تھا۔ مقامی کھڈی کے بنے ہوئے پٹو کی شلوار قمیض، پاؤں میں پھوشو (خاص قسم کے پٹڑے کا جوتا) اور ہاتھ میں ۳۰۳ کی رائفل۔

راجہ رونددو کی عقابی آنکھوں نے آنے والے نوجوان کو چند لمحے بغور دیکھا۔نوجوان نے کہا۔

''اجازت ہو تو آپ کے قریب آ جاؤں۔''

''آ ؤ یہاں بیٹھو''

وہ بیٹھا اور بولا۔

''شاید آپ کو معلوم نہ ہو گلگت میں انقلاب آ چکا ہے۔یکم نومبر کی صبح کو پاکستان زندہ باد کے نعروں کی گونج میں گورنر ہاؤس پر ڈوگرہ پرچم کی جگہ پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا دیا گیا ہے۔بونجی چھاؤنی...''

راجہ رونددو کے چہرے پر یک لخت حیرت و مسرت کے جذبات نمودار ہوئے۔انہوں نے بات کاٹ کر پوچھا۔

''کس کی کمان میں؟''

''کیپٹن (اس وقت کیپٹن بعد میں کرنل) مرزا حسن کی زیر قیادت۔''

راجہ رونددو مسکرایا۔

یہ آتش بجان جوان کشمیر ہی سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کرتا ہوا آیا تھا۔

''ہاں آگے بولو۔''

''تین، چار نومبر کو بونجی چھاؤنی کا کامیاب اپریشن ہوا ہے۔ایک پلاٹون نے رام گھاٹ پل کو مسدود پا کر رونددو کے راستے سکردو کا رخ کیا ہے۔مجھے مرزا حسن خان نے اسی کی سرکوبی کے لیے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ کے تعاون سے اس پلاٹون کو راستے میں ہی واصلِ جہنم کروں۔''

''اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' راجہ محمد علی خان نے استفہامیہ نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''میں حراموش کھلتارو کا بختاور شاہ ہوں۔ میں قاتل ہوں۔مفرور ہوں۔حکومت ہند کو مطلوب ہوں۔ جہاد کے لیے بونجی پہنچا تھا۔ وہیں میں نے اپنے آپ کو اس اہم کام کے لیے پیش کر دیا۔''

''تم باہر انتظار کرو۔''

اور اس کے جانے کے بعد وہ وجیہہ جوان اُٹھا جس کی عمر کا ایک حصہ جاگیرداری روایات میں گزرا تھا۔اس نے کمرے میں چند چکر لگائے اور تب اپنے آپ سے کہا۔

''میں کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ مستقبل کا مورخ یہ لکھے کہ راجہ روندو نے اپنے مفادات کی خاطر قوم کے پاؤں میں پڑی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی بجائے ان میں مزید قفل لگا دیئے۔میری یہ حقیری جان اسلام پر قربان۔''

مینڈی کے پل پر بختاور شاہ کا سامنا بونجی چھاؤنی سے بھاگی ہوئی سکھ پلاٹون سے ہوا۔جنگی چالوں سے ناواقف ہونے کے باوجود وہ شیر دل ان سب پر حاوی ہوا اور اس نے انہیں شدید نقصان پہنچا کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

اور وادی روندو کا تاجدار اپنے قرب وجوار میں ڈوگرہ فوج کی موجودگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دیوانہ وار اس جنگ میں کود پڑا۔ تین سو رضا کاروں پر مشتمل ایک رضا کار دستہ مرتب کیا۔جن کے پاس سکھوں سے حاصل کی ہوئی رائفلوں کے علاوہ پرانی ماشہ دار اور ٹوپی دار بندوقیں تھیں اس دستہ نے بڑی جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے گربی داس تونگرس اور باغیچہ کے سوا روندو کا باقی سارا علاقہ ڈوگرہ فوج سے آزاد کرا لیا۔

مزید آگے بڑھنے سے قبل انہوں نے مرزا حسن خان کا تعاون مانگا۔

سکردو میں حالات بہت نازک تھے۔ وادی روندو کے واقعات نے ڈوگروں کے ساتھ بلتیوں کی عدم وفاداری بالکل بے نقاب کر دی۔لیکن مسلح جدوجہد کے لیے گلگت کی طرح یہاں مقامی سکاؤٹس نہیں تھے۔ چند سابق فوجی اور وہ بھی غیر مسلح۔ ڈوگرہ انتظامیہ نے راجہ

روندو کو گرفتار کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ لیکن وہ قابو نہ آئے۔ اس دوران انہوں نے سکردو کے سرکردہ لوگوں جن میں غلام وزیر مہدی، حکیم محمد لطیف اور راجہ محمد حسین شامل تھے کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان حالات میں میجر احسان علی آزاد فورس کے ساتھ بلتستان پہنچ گئے۔

انہوں نے فوج کی تنظیم نو کے بعد رنگروٹوں کی تربیت شروع کر دی۔ سکردو میں ڈوگرہ چھاؤنی تھی۔ سابق سکستھ جموں اینڈ کشمیر انفنٹری بٹالین کو پھر سے منظم کیا جا رہا تھا۔ سری نگر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ جہاں تربیت یافتہ ریاستی فوج تباہ کن ہتھیاروں سے لیس کھڑی تھی۔ اس کی پشت پر انڈین آرمی اور ایئر فورس بھی تھی۔ دشمن کے حملوں کی صورت میں پاکستان سے فوری امداد بھی ناممکن تھی۔ کیونکہ کوئی آسان زمینی راستہ موجود نہ تھا ہوائی سروس کے لیے پاکستان کے پاس ہوائی جہازوں کی سخت کمی تھی۔ پاکستان اس وقت یوں بھی اپنے مسائل میں گھرا ہوا تھا۔ ہوائی راستہ خطرناک ترین راستوں میں سے تھا اور سب سے بڑھ کر موسم ناقابل اعتبار تھا۔

ان حالات میں سکردو چھاؤنی کا پہلا محاصرہ کیا گیا اور وہ ناکام ہوا۔ ڈوگرہ فوج مورچوں سے نکلی اور سارے سکردو میں قتل وغارت کا بازار گرم ہو گیا۔

اب لوگوں کے لیے صرف دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں کہ یا تو اپنے تئیں ڈوگروں کے حوالے کر دیں یا پھر ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں تک کہ لڑتے لڑتے ان سے آزادی حاصل کر لیں یا پھر شہادت کے درجہ پر فائز ہو جائیں۔

بس تو دوسرا راستہ اختیار کیا گیا اس میں دینی جذبے کی تسکین کا سامان بھی تھا۔ اب یہی صورت تھی کہ پسپائی اختیار کرنے والی فوج کو واپسی پر مجبور کیا جائے۔ اسے ہر تعاون کا یقین دلایا جائے چنانچہ راجہ سکردو نے اٹھارہ رکنی وفد اپنے بیٹے کی سرکردگی میں فورس کے تعاقب میں روانہ کیا جو میجر احسان علی سے قمراہ میں ملا۔ میجر احسان اور میجر بابر خان دونوں قمراہ میں آغا سید علی کے گھر میں تھے اور روندو کی جانب واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

ان کی فوج واسوتک تتر بتر ہو چکی تھی۔ میجر احسان علی نے مقامی لوگوں کی عدم شمولیت کا بھی گلہ کیا۔ بڑی بحث تکرار کے بعد میجر احسان واپسی کے لیے رضامند ہوئے۔

۹ فروری کو پرکشاق پر متعین ڈوگرہ فوج سے جھڑپ ہوئی۔ پرکشاق پر متعین میجر کرشن سنگھ میجر احسان علی کا واقف تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی کئی دنوں سے کئی فٹ برف میں بھوکے غاروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اس نے بہتیرے طرے مارے کہ اسے زندہ میجر احسان کے سامنے پیش کیا جائے پر بھری ہوئی فوج نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو چنار پڑی پر گولی سے اڑا دیا۔

بارہ فروری کو شگر میں پاکستان کا پرچم لہرا دیا گیا۔ شگر کے راجہ نے آزاد فورس کی مدد کے لیے رضا کاروں کے دستے بھیجے اور اشیائے خورد و نوش کی فراہمی کا سلسلہ جنگ بندی تک جاری رہا۔ لیفٹیننٹ بابر خان نے وادی روندو کے راجہ محمد علی خان کو لکھا کہ وہ انہیں ہتھیار بند، کلہاڑے اور تلواروں وغیرہ کے ساتھ پانچ سو سرفروشوں پر مشتمل ایک لشکر فوراً بھیجیں۔'

سکردو چھاؤنی کا محاصرہ فروری سے شروع ہوا اور اگست تک جاری رہا۔ اس دوران آزاد فوج پوریگ میں لڑی۔ دراس اور زوجی سر فتح ہوا۔ لیہ اور نوبرہ میں پیش قدمی کی گئی اور جون کے دوسرے ہفتے میں کرنل متاع الملک دو سو چترالی رضا کاروں کے ساتھ سکردو پہنچ گئے۔ ہزارہ اور سوات سے بھی ایک سو رضا کاروں کا ایک لشکر براہ شغر تھنگ سکردو پہنچ گیا تھا۔ اس لشکر نے زنبیر گڑھ (موجودہ حمید گڑھ) اور پرتاب گڑھ کی طرف مورچے سنبھال لئے۔

مسلسل کئی ماہ سے محصورین کو اشیائے خوردنی کی قلت محسوس ہونے لگی تھی۔ بھارتی طیاروں نے راشن وغیرہ ڈراپ کرنا شروع کیا مگر ان اشیاء کا زیادہ حصہ مجاہدین کے ہاتھ آتا۔

اس وقت سکردو مجاہدین کی باقاعدہ اور تربیت یافتہ فوج سے یکسر خالی تھا۔ یہ فوج سکردو سے دور محاذوں پر دشمن سے برسرپیکار تھی۔ پر دشمن کے طیاروں کی سکردو میں آمدورفت کے ساتھ ہی یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ دشمن سکردو کے اردگرد میدانوں میں چھاتہ بردار فوج اُتار کر

دوبارہ قبضہ نہ کر لے۔ ایسی صورت میں دشمن کا مقابلہ متاع الملک اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ چنانچہ چھاؤنی پر فیصلہ کن حملے کے لیے استور سے دو ۱۱۰۷ توپیں لانے کا فیصلہ ہوا۔

۱۲ اگست کی صبح ساڑھے چھ بجے دونوں توپوں نے چھاؤنی، کھرپو چو قلعہ مڈل سکول راجہ کے محل اور پرانے قلعے پر گولہ باری شروع کی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ ۱۲ اگست کو دشمن کے ٹھکانوں پر شدید گولہ باری ہوئی اور اس کے ساتھ ہی چھاؤنی پر بھر پور حملہ کر دیا گیا۔ ۱۳ اگست کا پورا دن طرفین کے درمیان سخت فائرنگ کا تھا۔ یہ بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ اب تک موسم خراب رہا تھا ورنہ بمباری سے مجاہدین کے ٹھکانے تباہ کر دیے جاتے اور محصورین کو رسد کی فراہمی جاری رہتی تو جنگ اور طوالت پکڑ لیتی۔

چودہ اگست ۱۹۴۸ء کی صبح کرنل تھاپا کیپٹن گنگا سنگھ، کیپٹن ہلال سنگھ اور دیگر فوجی افسر وردیوں میں فوجی ڈسپلن کے ساتھ چھاؤنی سے باہر نکل آئے۔ کیپٹن محمد خان نے انہیں کرنل متاع الملک کے پاس پہنچایا۔

اسی وقت سکردو چھاؤنی پر پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا دیا گیا۔

۲۶ اگست کو سکردو کے پولو گراؤنڈ میں تقریب آزادی کا جشن منایا گیا۔ فوجی اور سول حکام اور عوام نے شرکت کی۔ یہ کیسا روح پرور نظارہ تھا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد اللہ کے حضور شکرانہ پیش کیا گیا۔ پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد اور آزاد کشمیر زندہ باد کے نعروں میں پاکستانی پرچم لہرایا گیا۔ سکاؤٹوں اور بلتستان نیشنل گارڈز کے دستوں نے پاکستانی پرچم کو سلامی دی۔



روح اللہ بس اس کے بھائی شبیر کی طرح مچلے بیٹھا تھا اور اس کی ہر دلیل کو گاجر مولی کی طرح کاٹے جاتا تھا۔ وہ کیتھی اور شاور کے ساتھ شگر جانا چاہتی تھی اور بار بار کہے جاتی تھی۔

"تم تو سارا دن ڈیوٹی کے چکروں میں اُلجھے رہتے ہو۔ بڑے بھائی تعلیمی میدان کے مصروف بندے، سیماں کے بچے چھوٹے۔ ایسے میں تم مجھے کہاں لے جاتے پھرو گے۔ کچھ لوگ جا رہے ہیں، ان کی کمپنی بھی رہے گی۔"

میرا اس کی تو ایک ہی رٹ تھی" میں آپ کو اچھے اور ذمہ دار ہاتھوں میں سونپنا چاہتا ہوں۔" زچ ہو کر اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"چلو بابا ٹھیک ہے، جیسا تم چاہتے ہو کر لو۔"

اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے سیماں کو شگر چلنے کا حکم دے دیا۔ سیماں کو سیر سپاٹے اللہ دے۔ اس نے پل بھی نہ لگایا اور جھٹ تیار۔ بڑے بھیا اور بھابھی بھی ساتھ ہو لئے کہ چلو ہم بھی تھوڑا سا گھوم پھر آئیں۔

دونوں بھائی آگے بیٹھ گئے۔ شبیہ اس کی گود میں آ گئی۔ جیپ میں لدلدائی ہو گئی۔ سیماں سرخ چینی اوڑھنی جسے وہ ابھی کل خرید کر لائی تھی اوڑھے غضب ڈھا رہی تھی۔

شگر کی پوری وادی قراقرم کے دامن میں ہے۔ اسے بلتستان کی حسین ترین وادی کہا جا سکتا ہے۔ یہ چوڑائی میں کم اور لمبائی میں زیادہ ہے۔ مشہور زمانہ چھوغو بروم، رگا شا بروم بلتورہ اور بیافو گلیشیئر اس وادی کے انتہائی شمال میں واقع ہیں۔

وہ تھور گو پل پر سے گزر رہے تھے کوئی پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ دریائے سندھ کا مٹیالا پانی زوروں پر تھا۔ جیپ اب سہ تھنگ کے علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ روح اللہ پھر شروع ہونے والا تھا۔ جب بڑی بھابھی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''روح اللہ! تم گاڑی ٹھیک سے چلاؤ اور ہسٹری چھوڑو۔ اب اگر یہاں ہزاروں فٹ نیچے دریا نہیں بہتا تب بھی منوں وزنی پتھر تو ہیں جو تمہارے دائیں بائیں پڑے ہیں۔ پہاڑی ودّے بھی شروع ہونے والے ہیں۔ میں چھ بچوں کی ماں ہرگز ہرگز سہ تھنگ کے اس ریتلے میدان میں مرنا نہیں چاہوں گی۔''

بنجر اور خشک پہاڑوں سے سورج کی آتشیں کرنیں ٹکرا ٹکرا کر سارے میں دوزخ کی آگ بکھیر رہی تھیں۔ ان کے سر منہ ریت اور دھول سے اٹ گئے تھے۔

سہ تھنگ اور سرفہ رانگا کے ریتلے میدان کو دریائے سندھ پر پمپ لگا کر لفٹ ٹینکی کے ذریعے آباد کرنے کی سکیم زیر غور ہے۔

کو تھنگ پائین اور کو تھنگ بالا کی وادیاں صحرا میں کسی نخلستان کی طرح نمودار ہوئیں۔ بلند و بالا اور ہریالے درختوں نے جلتی آنکھوں کو طراوت اور ٹھنڈک کا احساس دیا۔ یہ وادی شگر کا پہلا گاؤں تھا۔ اس گاؤں کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ یہاں کے جیالے لوگوں نے راجہ شگر کے ساتھ شرگوتوق کے مقام پر میٹنگ کی اور سکھوں کو ملک بدر کرنے کا فیصلہ کیا۔

تقریباً تین میل تک دروں کا راستہ تھا۔ بلند و بالا پر ہیبت آگ کی طرح تپتے پہاڑوں کو دیکھ دیکھ کر طبیعت بوجھل ہو گئی تھی۔ مرو پی کی سرسبز وادی آئی اور پھر شگر کا علاقہ شروع ہو گیا۔

درختوں کے لمبے چوڑے سلسلے نشیب میں پھیلے نظر آتے تھے۔ جیپ دو رویہ درختوں سے گزرتی جا رہی تھی۔ گھنے درختوں میں سے جھانکتی کرنوں کے مختلف عکس زمین پر مختلف صورتوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔ دو تین مسجدیں گزریں۔ نمازی کھڑے باتیں کرتے تھے۔ گندم کے کھیت بسنتی لباس پہنے قربان ہونے کے لیے صف بستہ تھے۔ شگر نالہ پر واقع ریسٹ

ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں روح اللہ نے جیپ روک دی۔ بڑے بھیا بولے۔

''تم لوگ جلدی سے منہ ہاتھ دھولو۔ اسسٹنٹ کمشنر داؤد صاحب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔''

ان تینوں نے منہ اور ہاتھوں کی گرد اُتاری۔ کنگھی کی اور جیپ میں بیٹھ مسٹر داؤد کے ہاں جا اُتریں۔ ہرے بھرے کھیتوں میں گھرا ان کا سرکاری بنگلہ اندر سے مکین کی سادہ اور درویشانہ طبیعت کا پتہ دیتا تھا۔ مگر کے داؤد صاحب کی شخصیت متین اور بردبار نظر آتی تھی۔ خوبصورت اور بوٹے سے قد کی ان کی بیگم ان سے بھی زیادہ حلیم تھیں۔

میز پر اُبلے چاول، گوشت اور آلو کا شوربا، پالک کا ساگ، سلاد اور اچار ان کے انتظار میں تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئے اور جب وہ قہوہ پی رہے تھے، روح اللہ بولا تھا۔

''یہ میری بہن ہیں۔ شگر میں کچھ دن رہنا چاہتی ہیں۔''

اور داؤد صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

''میاں اگر یہ آپ کی بہن ہیں تو ہماری بہن بھی ہوسکتی ہیں۔ باقی آپ انہیں یہاں لے آئے ہیں تو بس اطمینان رکھیے۔''

سب کا قہقہہ کمرے میں گونج اُٹھا۔

داؤد صاحب کو کسی ضروری کام سے ایک گھنٹہ کے لیے دفتر جانا پڑا۔ ان کی عدم موجودگی میں شگر کے چند سرکردہ لوگ آئے۔ گفتگو شمالی علاقہ جات، خصوصی طور پر بلتستان کی آئینی حیثیت پر ہونے لگی تھی۔ ایک نامی گرامی ایڈووکیٹ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

''میں سمجھتا ہوں، حکومت پاکستان کو ۴۸۔۱۹۴۷ء میں نظم ونسق سنبھالنے کے ساتھ ہی الحاق کے متعلق وضاحت کر دینی چاہیے تھی۔ مقامی لوگوں کو انتظام حکومت میں شریک کرنا چاہیے تھا پر ۱۹۷۰ء تک یہ علاقے ایک ریزیڈنٹ کے ماتحت رہے جو بیک وقت لوکل گورنمنٹ، مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ، انسپکٹر جنرل پولیس اور بلا شرکت غیرے جج ہائی کورٹ ہوتا

تھا۔۱۹۷۲۔۱۹۷۱ء میں وزیراعظم بھٹو نے پہلی دفعہ یہاں سیشن کورٹ کا اجراء کیا۔ایف سی آر ختم کیا۔راج گیری نظام ختم کر کے مالیہ معاف کیا۔یہ سب تو ہوا پر آئینی حیثیت پھر بھی متعین نہ ہوسکی۔مزے کی بات یہ بھی ہے کہ گلگت و بلتستان میں کوئی دستور پاکستان بھی نافذ نہ ہوا۔ اس سے قبل جتنی بار بھی مارشل لاء لگا،اسے اس علاقے تک نہیں بڑھایا گیا تھا۔پھر ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء میں گلگت بلتستان پاکستان کا پانچواں زون E بنا۔لوگوں نے سکون کا سانس لیا چونکہ مارشل لاء صرف اندرون ملک لگتا ہے۔اس لیے ان علاقوں کی اب کوئی متنازعہ حیثیت باقی نہیں ہے۔ضلع گلگت کی ایک فوجداری لاہور ہائی کورٹ میں دائر ہوئی تو ایک ڈویژن بنچ نے فیصلہ دیا کہ گلگت بلتستان،پاکستان کے قانونی حصے نہیں۔اس لیے جس نے بھی یہاں مارشل لاءنافذ کیا وہ علاقے کی آئینی پوزیشن سے نابلد ہوگا۔

شمالی علاقہ جات کے لوگ محب وطن،پرامن اور نیک نیت ہیں۔اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ۳۷ سال گزارنے کے بعد بھی کوئی تحریک چلا کر پاکستان کے مسائل میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔

جنرل محمد ضیاءالحق نے بھی اپنے دورہ گلگت کے دوران غیرمبہم الفاظ میں کہا تھا کہ شمالی علاقہ جات پاکستان کے حصے ہیں،اورانہیں آئندہ اسمبلی میں باقاعدہ نمائندگی دی جائے گی۔

کوئی بھی قوم اتنے طویل عرصے تک بغیر کسی آئین کے اور بغیر بنیادی انسانی حقوق کے نہیں رہ سکتی۔اگر گلگت و بلتستان کے چھ لاکھ عوام کو بنیادی حقوق سے نوازا جائے تو یہ ان پر احسان عظیم ہوگا۔ایک ایسی وفادار قوم کو خواہ مخواہ مایوس،بددل بے چین اور غیر یقینی حالت میں رکھنا مفاد عام میں نہیں۔

اور وہ بیٹھی کھلے کانوں سے یہ سنتے ہوئے باہر دیکھتی اور سوچتی تھی۔

اللہ نے اسے کتنا بیدست و پا بنایا ہے۔بھلا وہ کہیں صاحب اقتدار ہوتی تو..........

اوراس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔اس کے ہونٹوں پر ہنسی بکھرگئی تھی۔



وہ جب منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آئی میز پر ایک پلیٹ میں بسکٹ چینی مگ اور ٹی پوٹ ٹرے میں رکھے ہوئے تھے۔اس نے چائے پینی شروع کی اور جب وہ خالی مگ میز پر رکھ رہی تھی۔داؤد صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"مجھے امید ہے کہ آپ کی رات اچھی گزری ہوگی۔"

اور اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"رات تو واقعی اچھی گزری، پر صبح کا آغاز اچھا نہیں ہوا۔اگر آپ یوں مجھے اچھوتوں کی طرح ناشتہ اور کھانا دیں گے تو میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔"

اور داؤد صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"اگر ایسی بات ہے تو بسم اللہ، میں دفتر جا رہا ہوں۔آپ بیگم اور بچوں کے ساتھ ناشتہ کریں، اور ہاں آپ کا پروگرام۔" وہ باہر جاتے جاتے رُکے۔"کہیں جانا چاہتی ہیں آج۔"

"ایک تو میں فونگ کھر (چٹانی محل) دیکھنا چاہتی ہوں۔دوسرے راجہ فیملی سے بھی ملنے کا ارادہ ہے اور تیسرے میں آپ پر واضح کرنا چاہتی ہوں کہ میری موجودگی کو اپنے معمولات میں کوئی رکاوٹ نہ سمجھئے۔سارا دن آوارہ گردی کے بعد میں شام کو اپنے ٹھکانے پہنچ جایا کروں گی۔"

داؤد صاحب کا قہقہہ ایک بار پھر فضا میں گونجا۔

"یہ علاقہ پُر امن اور یہاں کے لوگ انسان دوست ہیں۔آپ کو تنہا گھومتے ہوئے

کوئی خوف وخطر نہیں جہاں آپ کو سواری کی ضرورت محسوس ہو بتا دیں، اور ہاں یہ بات میں آپ کے گوش گزار کردوں گا کہ جب راجہ فیملی سے ملنے جائیں تو انہیں مناسب عزت و تکریم دیں۔ گو راجگی نظام اب ختم ہو چکا ہے اور جاگیرداری روایات دم توڑ رہی ہیں۔ پر ہم لوگ پھر بھی ان روایات کی تھوڑی بہت پاسداری کرتے ہیں۔''

داؤد صاحب کی جیپ سٹارٹ ہو کر گیٹ سے باہر نکل گئی اور وہ کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف آ گئی۔

مسز داؤد اُردو نہیں بول سکتی تھیں۔ ان کی مادری زبان بروشسکی تھی لیکن بچے ٹھیک ٹھاک اُردو بول رہے تھے۔ چٹائی پر بیٹھے سب نمکین چائے کے ساتھ چوکور پراٹھے کھا رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ چوکڑی مار کر بیٹھی اور ہنستے ہوئے اس نے پورا پراٹھا کھایا اور چائے کا پیالہ پیا۔

پھر وہ فونگ کھر دیکھنے نکلی۔ اونچی نیچی راہوں پر پھلدار درختوں کی چھاؤں میں ستاتے اور چشموں کا شور سنتے سنتے وہ شگر بازار میں جا پہنچی۔ بمشکل بارہ تیرہ دوکانیں تھیں۔ دوپٹ کے چوڑے دروازوں کے اندر دکاندار بیٹھے مکھیاں مارتے تھے۔ کوئی کوئی گاہک کھڑا کچھ خریدتا تھا۔ اکاؤکا لوگ آتے جاتے تھے۔ ان لوگوں میں کچھ منگولی خدوخال والے بھی تھے۔

دراصل ابن کنولہ بکتوریہ خاندان کا آخری شہزادہ پانچویں صدی قبل مسیح میں جب مردان کے شنواریوں اور خیبر کے آفریدیوں سے شکست کھا کر بالائی وادی سندھ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تو اس کا قافلہ جلکوٹ پر پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک وادی شگر میں آیا اور دوسرا گریگرت چلا گیا۔ وادی شگر کے جو لوگ منگولی یا گلگتی لگتے ہیں، بکتوریہ اصل ہیں۔

کھیت کٹائی کے لیے تیار کھڑے تھے۔ کہیں کہیں کوئی عورت کمر پر چوروٹنگ کسی نظر پڑتی۔ وہ ذرا دم لینے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ ماحول پر الوہی سکون برستا تھا۔ چشموں کا شور یا

پرندوں کی چہچہاہٹ ہی بس اس سناٹے کو توڑتی تھی۔ ''اللہ وہ اپنے آپ سے بولی تھی۔

''یہ دنیا اس شور شرابے پکڑ دھکڑ، مار دھاڑ اور ہنگامہ خیز دنیا سے کس قدر مختلف ہے۔

روح اللہ پر اسے شدید غصہ آیا تھا۔ بلا وجہ اس کا ساتھ کیتھی اور شادر سے چھڑوا دیا ان کی کمپنی'' یقیناً سیاحت کے اس لطف کو دوبالا کرتی۔

اب وہ پھر چل پڑی تھی۔ گھروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کم عمر پاؤں سے ننگے، خوب صورت چہروں والے بچے ایک جگہ چکہ (جدید کرکٹ کی ایک قدیمی شکل) کھیل رہے تھے۔ ایک گھر کے سامنے گائے بندھی تھی۔ ایسی خوب صورت کہ بے اختیار اس نے کسی سے اس کی نسل کے بارے میں پوچھا۔

یہ گائے اور یاک کی مشترکہ نسل سے تھی۔ زومو جو بہت زیادہ دودھ دیتی ہے۔ بہت خوب صورت اور بہت شریف ہے۔ کہیں کسان فصل خریف کے لیے کھیت تیار کر رہے تھے۔ زو ہل چلانے میں جتے ہوئے تھے۔ کسان پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ وہ ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ پالک توڑتی ایک عورت سے اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اب ان کھیتوں میں کیا بویا جائے گا۔ لیکن ''زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم'' والا معاملہ تھا۔ دس بارہ سال کا ایک بچہ دُور سے بھاگتا ہوا آیا اور ترجمانی کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس زمین میں چنا، کنگنی، ترنبہ اور باجرہ بویا جانے والا ہے۔

فو تنگ کھر کے لیے اس نے کوئی دس آدمیوں سے پوچھا ہوگا۔ اب وہ منزل پر پہنچ گئی تھی، اور اسے اس راستے پر مڑنا تھا۔ جس پر چند گز چل کر فو تنگ کھر آتا تھا۔ راستہ تنگ اور خاصہ دشوار تھا۔ صرف ایک آدمی بمشکل چل سکتا تھا۔ نیچے دریائے شگر بے ہنگم شور مچاتا تھا۔ چار قدم چلی تو داہنے ہاتھ لکڑی کی ایک مسجد نظر آئی۔ سیڑھیاں چڑھتی اندر داخل ہوئی۔ ایک آدمی چادر لپیٹے بیٹھا تھا۔ پتہ چلا کہ نو سو سال پرانی مسجد ہے۔ مسجد کیا تھی، چوب کاری کا ایک شاہکار تھی۔ یہ ہفت در ہے، اسے ہشت در کہتے ہیں، اور یہ موج دریا ہے۔

ادھیڑ عمری کی حدوں کو پاٹتا ہوا مرداسے انگشتِ شہادت سے کھڑکیوں، دروازوں اور جھروکوں پر لکڑی کی جوڑ جوڑ کر بنائی گئی فنی کاریگری کو دیئے گئے مختلف ناموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

آدھ گھنٹہ بعد وہ سیڑھیاں اُتر آئی۔ سامنے چنار کا بوڑھا درخت پر پھیلائے کھڑا تھا۔ سائے میں چند مرد اور عورتیں بیٹھی تھیں۔ چنار کے بارے میں اس نے یہاں آکر سنا تھا کہ پانچ سو سال کی عمر پوری کرنے کے بعد، درخت کو اپنے آپ آگ لگ جاتی ہے۔ حیرت کی بات تھی۔

سامنے دو منزلہ نیا محل نظر آرہا تھا۔ اس کے پیچھے پرانا محل، فونگ کھر اور دائیں ہاتھ بلند و بالا کھری ڈونگ (پہاڑ کا نام) پر ٹوٹے پھوٹے قلعے کے آثار نظر آتے تھے۔ بارہ دری اور باغ ویران تھے۔

اور جب وہ پرانے محل کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ ایک خوبصورت سا نوجوان سامنے آیا۔ پتہ چلا کہ راجہ شگر مرحوم کا صاحبزادہ اعظم خان ہے۔ اسلامیہ کالج سول لائنز میں بی۔اے کا طالب علم ہے۔

گائیڈ کے فرائض اس نے سنبھال لیے تھے۔ سارا محل ایک چٹان پر بنا ہوا ہے۔ جس کا ایک کونہ سیڑھیوں کی طرف تھا اور دوسرا دریائے شگر کی طرف نکلا ہوا تھا۔

ٹوٹے پھوٹے شکستہ محل کے کمرے جانوروں کے اصطبل بنے ہوئے تھے۔ جاروق میں پتلی سی چٹائی پر سیندوری رنگ کی خوبانیاں پڑی سوکھتی تھیں۔ دیوانِ عام اور دیوانِ خاص انتظار گاہ، راجہ کی نشست گاہ سب ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار ہو کر ویرانی کی گود میں پڑے تھے۔

اس کے سارے سر یر میں دکھ یاس اور بے ثباتی کی ٹھنڈی لہریں اُترنے لگیں۔

اعظم اسے لے کر نئے گھر کی طرف بڑھا۔ ڈرائنگ روم میں جدید وضع کے صوفے رکھے تھے کارنس پر چارسوتی کلا انگیٹھی پوش جس پر نیلے پیلے دھاگوں کی بدوضع کڑھائی نظر پر

گراں گزرتی تھی۔ دیواروں پر چیتے اور بھیڑیئے کے حنوط شدہ چہرے لٹک رہے تھے۔

اور پھر رانی ماں بیٹے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ کھڑی ہوئی۔ اس نے دو سلام کئے۔ سلام کے ساتھ ہی قدرے جھک کر دائیں ہاتھ کو پیشانی تک لے گئی۔ یہ یہاں کی قدیم تہذیب تھی۔

پھولدار پاکستانی فلیٹ کے فیروزی سوٹ اور سفید ململی چکن کے دوپٹے میں لپٹی دبلی پتلی رانی شگر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ چہرے کی جھریاں ابھی زیادہ گہری نہیں ہوئی تھیں۔ ملائمت اور نقوش کا تیکھا پن آریائی نسل سے تعلق کا پتہ دیتا تھا۔ شگر کا راجہ خاندان اماچہ آریائی نسل سے بتایا جاتا ہے۔

ذرا دو پٹہ سرکا تو ان کے گلے میں اس نے لداخ کے قیمتی فیروزوں کا حلقہ بند دیکھا۔ جو سونے کے پتروں میں جڑا ہوا تھا۔ فیروزہ اتنا خوبصورت اور قیمتی نظر آتا تھا کہ بے اختیار اس کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔

اوپر تلے کی دو بچیاں ننگے پاؤں بھاگتی آئیں، اور رانی شگر سے لپٹ گئیں۔ یہ اعظم کی بچیاں تھی، اس کی بیوی چھوٹے بچے کے ساتھ گلگت گئی ہوئی تھی۔

وہ اسے سرتاپا ایک ٹوٹی ہوئی شخصیت نظر آئیں۔ اداسی اور دُکھ کی چادر میں لپٹی ہوئی۔ ملازم نے ٹھنڈی رسیلی خوبانیاں اور آلو بخارا لا کر تپائیوں پر رکھا۔ وہ خوبانیاں کھاتی گئی اور ان کی باتیں سنتی گئی۔ ان وقتوں کی جب رعایا دم بھرتی تھی۔ نوکروں کی فوج ظفر موج دست بستہ حاضر رہتی تھی۔ ان گزرے دنوں کی باتیں جب یہ محل اتنے ویران نہیں ہوتے تھے۔ جب زندگی حسین اور رعنائیوں سے پُر تھی۔

اور اب ....

اس نے چاہا کہ پوچھے پر رُک گئی۔ ضرورت ہی کیا تھی؟ سب کچھ تو عیاں تھا۔ خواہ مخواہ کھرنڈ کھرچنے سے فائدہ۔



خانقاہ معلیٰ کی طرز تعمیر اور کشادگی کا سارا حسن، کشمیری فنکاروں کی دل کش کشیدہ کاری دبچی کاری کا فسوں اس کے چاند کی مانند چمکتے گنبد کی خیرہ کن دمک سب اس محاورے کی نذر ہو گئے تھے۔ جسے نشہ ہرن ہونا کہتے ہیں۔

ان چار ستونوں میں سے ایک کہ جن پر یہ عمارت ایستادہ تھی۔ وہ تیس فٹ اونچے اور کم وبیش چھ فٹ چوڑے ستون کو چھپالیے یوں کھڑی تھی جیسے پوہ ماگھ کی چاندنی رات ہو۔ اسے دیکھ کر خانقاہ معلیٰ کی ساری تاریخ کہ یہ ساڑھے چار سو سالہ پرانی خانقاہ سید میر یحیٰی نے تعمیر کروائی۔ سید یحیٰی جید کشمیری عالم ابوسعید کا بیٹا اور سید مختار کا بھائی تھا۔ جنہوں نے شگر میں سات خانقاہیں اور چودہ مسجدیں تعمیر کروائیں اور یہ کہ اس خانقاہ میں بیک وقت بارہ سو آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں اور یہ بھی کہ اس کی تعمیر میں سب سے زیادہ مدد وزیر شگر مہا سلطان نے کی۔

یہ سب دماغ کے کسی دور دراز گوشے میں یوں جا گرے جیسے کوئی سلیقہ شعار محتاط عورت زیورات کی پوٹلی جستی پیٹی کے کسی کونے میں پھینک دے۔

وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھی اور جب ان کی خاموش آنکھوں نے کئی بار ایک دوسرے کو دیکھ لیا تب پوہ ماگھ کی اُداس چاندنی نے فضا کا سکوت توڑا۔

''تم کون ہو؟''

اور اسے خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ اُردو بول سکتی ہے۔

''یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہتی تھی۔''

''میں تو بدنصیب ہوں۔'' اس کے اندر کا سارا دُکھ آنکھوں کے کویوں میں جمع ہو گیا تھا۔

''مجھے بھی ایسا ہی سمجھ لو۔ ان وادیوں میں سکونِ دل ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔''

دکھ کی سانجھ کا رشتہ بہت نرالا اور بہت انوکھا ہوتا ہے۔ اس خاموش اور پُرسکون جگہ میں جیسے پل بھر میں ان کے درمیان ایک رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگیں۔

پاشا یوں تو شگر خاص میں پیدا ہوئی لیکن بعد میں باپ کے ساتھ کافی عرصہ پنجاب میں رہی۔ اس کا باپ فوج میں لانس نائیک تھا۔ مختلف شہروں کے مختلف اسکولوں سے اُس نے مڈل پاس کیا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں متانت اور بردباری تھی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ملاقات میں ہی اپنا آپ کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ پاشا بھی ایسی ہی تھی۔

" ہمارے یہاں نئی فصل پکنے کے قریب ''ستروب لہ'' کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔ گندم کی کٹائی کل شروع ہونے والی ہے اور آج گھر میں قریبی عزیز کھانے پر آ رہے ہیں۔

کبھی کبھی ہنگامے بہت تکلیف دہ محسوس ہوتے ہیں۔ غم اور دُکھ تازہ ہو جاتے ہیں۔ جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں کہیں۔ رو دھو آؤں۔ اپنے آپ کو ہلکا کر آؤں۔"

دونوں کچھ اوپر جا کر ایک ہموار جگہ پر بیٹھ گئیں۔ یہاں سے وادی شگر درختوں میں گھری سرسبز و شاداب نظر آتی تھی۔

"میرا خیال ہے تم نے ابھی رونا دھونا تھا۔ خانقاہ معلّی کے ستونوں سے لپٹ کر گریہ زاری کرنی تھی۔ پر میں کسی بلائے ناگہانی کی طرح وارد ہو گئی اور وہ سب جسے تم باہر نکالنا چاہتی تھی۔ تمہارے اندر ہی رہا۔ لو اب مجھے وہ سب سنا دو تاکہ ہلکی تو ہو سکو۔"

جیسے بارش میں دھوپ نکل آئے۔ بس ایسے ہی اس کے ہونٹوں پر ٹوٹی پھوٹی ہنسی اُبھری تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر گیت گانا شروع کر دیا تھا درد بھری اس کی آواز پتہ نہیں پہاڑوں کا جگر چھلنی کر رہی تھی یا نہیں پر اس کا کلیجہ ضرور چھلنی ہو رہا تھا۔

برق مقبون بی ہلال باغنکسو ہالوے میندوق یسے تھوبند

ہالوے میندوق منتخ مین سوک دو انجن علی شیر خان ان سوک

ترجمہ: چٹان جیسے (مضبوط) مقبون کے ہلال باغ میں ہلو کا پھول کھلا نظر آتا ہے۔ یہ ہلو کا پھول نہیں، یہ تو علی شیر خان انچن تھا۔

۲۔ آپ تو ملکہ کو سینکڑوں انسانوں اور گھوڑوں کی معیت میں لائے تھے، اور اب واپس بھیجتے وقت ایک آدمی اور ایک گھوڑا بھی اس کے ساتھ نہیں۔

۳۔ آپ جب ملکہ کو (سکردو) لائے تو ہر قدم پر اس کے پیروں کے نیچے فیروزہ کی سلیں بچھا دیں اور اب (لداخ) واپس بھیجتے وقت اسے ننگے پاؤں بھیج رہے ہیں۔

یہ گیت میں نے اس وقت سنا تھا جب میری عمر یہی کوئی پانچ چھ سال کی ہوگی بوجھل اور سوگواری اس دوپہر کو جب میں اپنے بڑے ماموں کے ساتھ گلاب پور جانے کے لیے مچل رہی تھی۔ ماں مجھے گود میں اُٹھا کر اندر لائی تھی اور اس نے مجھے اپنے سامنے سفید اور سیاہ اون سے بنے چھرے پر بیٹھایا اور یہ گیت گانے لگی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ میری ماں کے اوپر بلہ بلنو (ایک بابرکت جنس) کا سایہ ہے۔ وہ گیتوں کی ایسی رسیا تھی کہ میرا خیال ہے جب دروزہ کی تکلیف جھیل کر اس نے مجھے جنا ہوگا تو میرے چہرے کو دیکھتے ہی اس نے گانا شروع کر دیا ہوگا۔ ہمہ وقت اس کے لب متحرک ہی رہتے میرا باپ جو مذہبی خیال کا آدمی تھا۔ وہ ہمہ وقت گنگنانے کی عادت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ابھی وہ زیادہ وقت میدانی علاقوں میں گزارتا تھا۔ دو تین بار اس کی ماں سے اس بات پر زوردار جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا تھا۔ میں تمہارے اور اپنے رشتے کو دائمی بنانے کا سوچ رہا ہوں (میری ماں اور باپ کا نکاح ''انقطاعی'' تھا) پر تمہاری یہ مراثیوں اور بھانڈوں جیسی حرکتیں مجھے ماتھے سے دکھتی ہیں۔

اور ماں نے دھیرج سے کہا تھا۔

''اسے کیسے چھوڑ دوں۔ بھلا کوئی جیتے جی کھانا پینا بھی چھوڑ سکتا ہے۔''

اور اس دوپہر جب ماں نے گانا شروع کیا تھا۔ میں نے پوچھا تھا۔

''ماں علی شیر خان انچن کون تھا۔ ماں ملکہ کے ساتھ گھوڑے اور آدمی کیوں نہیں تھے۔ ماں ملکہ کے قدموں میں فیروزے کیوں بچھائے تھے؟''

ماں نے میرے کسی بے تکے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں اب رونا دھونا بھول چکی تھی۔ ماں کی طرح گیت میری بھی رگ رگ میں سما گئے تھے۔ میری بھوک پیاس، رونا دھونا سب انہیں سنتے ہی ختم ہو جاتے تھے۔

یہ راز میدانی علاقوں میں اُتر کر مجھ پر منکشف ہوا کہ ماں اپنے دل و دماغ میں علی شیر خان انچن جیسے ایک جیالے کو بٹھائے ہوئے تھی۔ جس نے اس کے قدموں تلے فیروزے تو نہیں، پر قیمتی پتھر ضرور بچھائے ... البیلی شہزادی اور شہزادہ جو بالی عمریا کے دور میں ہی تھے کہ ایک دوسرے سے بچھڑ بھی گئے۔ ماں کو طلاق ہو گئی تھی۔ ماں کا دوسرا بیاہ بھی واپسی نہیں تھا۔

پھر یہ گیت میں نے بار بار سنا۔ علی شیر خان انچن کا پیکر میرے دل و دماغ میں بس گیا تھا اور پھر جب پڑھنے لکھنے لگی۔ تو اس گیت کے پس منظر میں جھانکنے کے قابل ہوئی۔

اس وقت جب پہاڑوں پر جمی برف پگھل رہی تھی اور وادیوں میں سبزہ پھیل رہا تھا پتھروں کے گھروں میں مقید سکڑی سکڑائی اور ایک طرح سے مفلوج زندگی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ وادیوں کے کھیتوں میں کاشت کا آغاز تھا۔

ایسے میں بہت بلندیوں پر فلک بوس چوٹیوں کو چھونے والے پُر ہیبت قلعے کھر پوچو میں بلتستان کا عظیم شہنشاہ علی شیر خان انچن جھروکے میں کھڑا سنہری دھوپ میں رنگی وادی سکردو کو دیکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فولادی عزم ہلکورے لے رہا تھا۔ ان میں آگے بڑھنے پھیلنے اور چھا جانے والی خواہشوں کی اُٹھان رقصاں تھی۔

وہ اس وقت تنہا تھا۔ رات جب عالم میں سناٹا تھا۔ تاریکی اور اندھیرا خوفناک تھا۔

اس لمحے چوب چراغوں کی روشنی میں قلعے کے خاص کمرے میں اس کے معتمد وزراء کا گروپ سامنے دیوار پر ٹنگے لکڑی کے بڑے تختے پر تیز دھار کے چاقو سے کھر چے گئے اس راستے کو دیکھ رہا تھا جو اس کے جنگی ماہرین اور سراغ رساں ٹولے نے دریائے شیوق کے ساتھ ساتھ لداخ تک بنایا تھا۔ گہری کھدی ہوئی رنگ آمیز موٹی لکیر پر دیوار کی نوکیلی چھڑی سے اس کے کمانڈر رانچیف نے راستے کی عمیق تنگ گھاٹیوں عمودی چڑھائیوں خطرناک موڑوں منہ زور آبشاروں بالائی پہاڑوں سے حملے اور سلائیڈز کے امکانات، پڑاؤ کے مقامات لداخیوں کی طرف سے مزاحمت کے کامیاب اور ناکام امکان ان کی اپنی فتح اور شکست کے امکانات کا تناسب ایک ایک نقطہ مکمل شب بھر کے طویل صلاح مشورے کے بعد اس کے کمانڈر جنرل شمشیر علی کنا پانے کہا تھا کہ بس اب لداخ فتح ہونا چاہیے اور کوچ کے لیے یہی موسم مناسب ہے۔ تیاریاں شروع کی جائیں یہ عظیم بلتستان اب عظیم تر ہو۔

وہ خوش نصیب تھا۔ کامیابیوں کا ہما اس کے سر پر سایہ فگن تھا۔ جس مہم کا ارادہ کرتا جس علاقے پر اس کی نظریں جمتیں وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھتا پورے ہوم ورک کے ساتھ گھوڑے کی باگ، ادھر موڑ دیتا، اور پھر اس کی فتح کے پھریرے اُڑنے لگتے۔ چترال سے کافرستان تک وہ شجاعت کے جھنڈے گاڑ بیٹھا تھا، اور اب لداخ اور تبت اس کی نظروں میں آ گئے تھے۔

گزشتہ ایک سال سے اس مہم کے لیے دن رات کام ہو رہا تھا۔ اس کے جاسوس ان علاقوں میں مقیم تھے اور ایک ایک بات کی خبر لائے تھے۔

دفعتاً اس کی نظریں نیچے گریں۔ پھول محل دھوپ میں چمکتا تھا اور ہلال باغ میں خوابیدہ بہاریں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اس نے دور اُفق کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ سینے میں کہیں درد اُبھرا ہے۔ اس درد کی نوعیت سے وہ بخوبی آگاہ تھا۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ اسے اپنے آپ کو پل بھر کے لیے بھی کمزور محسوس کرنے سے نفرت تھی۔ شاید اسی لیے وہ برق رفتاری سے مڑا اور دیوان خاص میں داخل ہوا۔ چند لمحے وہاں ٹھہرا۔ دیواروں پر آنکھوں سے نکل کر جو

کچھ ابھرا اس میں کرب تھا۔ پھر باہر آ نکلا۔ بالکونی سے نیچے جھانکا۔ چہار باغ میں فوارے چلتے تھے اور سنگ مرمر کی بارہ دریاں ویران تھیں۔ پل بھر میں چھم چھم کرتی پھول شہزادی نے فضا سے اُتر کر بارہ دریوں کی ویرانیوں کو ماند کر دیا۔

اس نے لمبا سانس بھرا اور اپنے آپ سے بولا

گل خاتون میں تمہیں بھول جانا چاہتا ہوں پر تم کبھی رینگ کر اور کبھی کد کڑے لگاتی میرے اندر سے باہر کیوں آ جاتی ہو۔ وہ درد جو اس کے سینے میں کہیں اُٹھا تھا۔ اب آنکھوں میں اُترنا چاہ رہا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے اپنے گورنر علی عباس گیجا پا کو بلایا اور اس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

اب جب بہاریں اپنے عروج پر تھیں اور فطرت کے حسین مناظر دامن دل کو کھینچتے تھے اس نے لداخ فتح کیا اور لداخ کے مہاراجہ جمیا نگ نمگیل کو گرفتار کیا۔ دارالخلافہ لیہ میں اپنی فوج کا ایک حصہ چھوڑ کر طوفان کی طرح آگے بڑھا اور بدھا کے سٹوپے اور بڑے بڑے چوبی مجسمے تہہ تیغ کرتا بہت آگے نکل گیا۔ جھیل مانسرور اور نیپال کے درمیان پورا اٹنگ قصبے تک۔

وہ تبت کو چھونا چاہتا تھا۔ پر اس کی فوج تھک گئی تھی۔ واپس لوٹ جانے کی خواہش ان کی پیشانیوں پر رقم تھی۔ اس نے یہ سب دیکھا محسوس کیا اور لوٹا لداخ کے دارالخلافہ لیہ میں دربار سجا کر اس نے راجہ لداخ کو طلب کیا۔ تیتی اور آریائی حسن کی آمیزش کی حامل شہزادی جس کے انداز میں دڑدوں جیسی بے باکی اور دلیری تھی اپنے باپ مہاراجہ جمیا نگ نمگیل کا بازو تھامے اس کے حضور حاضر ہوئی تھی۔ اس حسین شاہکار نے گھٹنوں کے بل جھک کر اسے مقامی رواج کے مطابق آداب کیا پھر سیدھی کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ بات غیرت کے منافی ہے۔ مگر مجبور ہوں اور چاہتی ہوں کہ ہم سے حسن سلوک ہو۔''

علی شیر خان انچن کو اس کے لہجے میں کھنکتی اعتماد اور یقین کی جھنکار پسند آئی تھی۔ اس نے اس بات سے لطف اُٹھایا۔ اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت کو شوق و دلچسپی سے دیکھا تھا اور کہا تھا۔

''اگر میں فیصلہ کا اختیار آپ کو دوں۔''

اس نے فی الفور نفی میں سر ہلایا اور بولی۔

''یہ حق آپ کا ہے فاتح ہیں آپ۔''

وہ کچھ دیر اس کے چہرے کو دیکھتا رہا سوچتا رہا اور پھر گویا ہوا۔

''آپ میری ملکہ بننا پسند کریں گی۔''

شہزادی کے ہونٹوں پر گویا بارش کے بعد نمودار ہونے والی قوس و قزح جیسی مسکراہٹ بکھری۔ جھکی اسے تعظیم دی اور بولی۔''آپ جیسے جیالے شاہ کی ملکہ بننا میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔''

یوں یہ لداخی شہزادی علی شیر خان انچن کی زندگی میں آئی۔سکردو کے لیے واپسی ہمیشہ کی طرح بڑے کروفر سے ہوئی۔اہل سکردو نے اپنے فاتح بادشاہ اور بہادر افواج کا استقبال بہت گرمجوشی سے کیا۔شاہی خاندان نے بادشاہ کی ہدایت پر ملکہ کو بہت دل پذیر انداز میں خوش آمدید کہی۔ ہلال باغ سے پھول محل تک اس کی گزرگاہ کے راستے میں فیروزے کی سلیں بچھائیں جس پر دھرے اس کے ہر قدم پر اشرفیاں لٹائی گئیں۔

شب کو چراغاں ہوا۔محفل موسیقی بجی جمالیاتی ذوق رکھنے والی اس شہزادی نے خود سے چند گز کے فاصلے پر نیم دائرے میں بیٹھے اپنے سامنے آلات موسیقی سجائے بے خود فنکاروں کے ٹولے کو بے حد دلنواز اور مدھر دھنیں بجاتے دیکھا تو اسے اپنا سانس رُکتا محسوس ہوا۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتی تھی یہ علاقہ تہذیبی اور فنی لحاظ سے اتنے عروج پر ہوگا۔

اس نے اپنے دائیں ہاتھ بیٹھے شجاعت کے اس پیکر کو جو اس وقت شاہانہ لباس میں تمکنت سے بیٹھا ساز اور آواز میں گم تھا دیکھا اس کی آنکھوں میں سوال بھی تھے اور ان کے فن کو خراج عقیدت کا خاموش اظہار بھی تھا شاہ نے آنکھوں کو پڑھا مسکرایا اس کے پروقار چہرے پر غرور کا ہلکا سا غبار پھیلا اور اس نے کہا۔

''یہ دہلی کے درباری موسیقاروں کے تربیت یافتہ ہیں۔ کلاسیکی اور مقامی سازوں کے سنگم سے انہوں نے بہت خوبصورت موسیقی تخلیق کی ہے۔''

''میرے خوش نصیب ہونے میں کوئی شک ہے۔'' ملکہ نے یہ بات اپنے آپ سے کہی تھی۔

اور جب مہاراجہ لداخ اور علی شیر خان انچن کے درمیان سکردو میں عہد نامہ طے پا گیا جس کے تحت مفتوح نے فاتح کا باجگذار رہنا منظور کیا۔ لداخ کا کچھ علاقہ بھی فاتح کو دینا قبول کیا، اور اپنی مملکت کی طرف روانہ ہونے سے قبل وہ بیٹی سے ملنے آیا۔ غلام گردشوں میں چلتی ملکہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی جب اس کے روبرو آئی تو مہاراجہ نے دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں حزن کے سائے لرزاں ہیں اور جب وہ بولی تھی اس میں ملال گھلا ہوا تھا۔

''لداخ کے پہاڑ ان پہاڑوں پر چمکتا سورج دھوپ میں ہلکورے لیتا جھیلوں کا پانی سرد قد پیڑ اور بدھا کے بچے کھچے ستوپے آپ کو خوش آمدید نہیں کہیں گے کیونکہ آپ نے اُنکی آبرو ریزہ ریزہ کر دی۔ بھلا عزتوں کے سودے کرنے والے کے لیے دلوں کے دروازے تھوڑی کھلتے ہیں۔ جایئے اپنے لوگوں کو عزت دیجئے۔''

ملکہ تو بہت ذہین تھی۔ شاہ کی آنکھ کو پڑھنا جانتی تھی۔ اس پر دل و جان سے عاشق بھی تھی۔ پھر کیا ہوا تھا کہ دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ کچھ نہیں بتاتی ہے۔ شاہ اگر ملکہ کی کسی بات پر ناراض ہوا تو صلح کیوں نہ ہوئی۔ طلاق تک نوبت کیوں پہنچی۔ ملکہ شاہ کے اس فیصلے پر کس قدر دُکھی تھی۔ وہ کیسا قیامت کا سمے تھا جب اسے لدّاخ بھیجا جا رہا تھا۔ سکردو سے رُخصت ہوتے وقت اس نے ایک نظر ہلال باغ پر ڈالی جہاں اس کا محبوب علی شیر خان انچن اپنے قلعے کھرپوچو سے نکل کر آیا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس وقت ملکہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے اندر کا درد اشعار کی صورت میں زبان سے نکل رہا تھا۔

چٹان جیسے (مضبوط) شاہ کے باغ میں ہلو کا پھول کھلا نظر آتا ہے۔ یہ ہلو کا پھول

نہیں۔ یہ تو علی شیر خان اعظم تھا۔ چٹان جیسے (مضبوط) شاہ کے ہلال باغ میں سرخ گلاب کھلا نظر آتا ہے۔ یہ سرخ گلاب کا پھول نہیں تھا یہ تو علی شیر خان انجن تھا۔

آپ جب ملکہ کو سکردو لائے تو ہر قدم پر اس کے پیروں کے نیچے فیروزے بچھائے اور اب اسے ننگے پاؤں واپس بھیج رہے ہیں۔

میں نے اس وقت یہ کتاب اُٹھا کر فرش پر ماری اور بھاگتی ہوئی جا کر ماں سے چمٹ گئی۔ علی شیر خان انجن کے ترشے پیکر میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ میں ماں سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس نے ملکہ کا محبت بھرا دل کیوں توڑا۔ کیا وہ اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔

ماں نے میرا ماتھا چوم کر کہا تھا۔

''دنیا ہمیشہ سے مرد کی ہے اور میری بچی! یہ ہمیشہ مرد کی ہی رہے گی، اور میں نے کھڑے ہو کر اپنے پاؤں فرش پر مارے اور کہا۔

''نہیں میں دل کے معاملے میں ایسا ظلم کبھی نہیں ہونے دوں گی۔''

اور پھر علی اصغر میری زندگی میں آیا۔ جیالا، شہ زور، خوبصورت اور امیر باپ کا بیٹا۔ وہ دریائے شگر کے دائیں ہاتھ ابجواڑی کے بڑے کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا۔ گھوڑے پر سوار وہ ہمارے گھر جس شام اُترا تھا۔ میں باغیچے میں کھڑی سبزیوں کی کانٹ چھانٹ میں لگی ہوئی تھی۔ دو چوٹیاں میرے سینے پر سانپوں کی طرح پھنکارے مارتی تھیں۔ میدانی علاقوں میں رہنے کے باعث میرے اوپر مقامی رنگ کی بجائے جدیدیت کا اثر غالب تھا۔ اس نے باگ کھینچ کر مجھے غور سے دیکھا اور پھر جست لگا کر فرش پر کودا تھا۔

اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کھرپوچو قلعے سے علی شیر خان انجن ہمارے گھر آیا ہو۔ آنکھوں سے دلوں کا فاصلہ طے ہونے میں بہت وقت نہیں لگا تھا۔ جسمانی فاصلے بھی اس کی کاوشوں سے جلد طے ہو گئے۔

شگر کی تاریخ میں مَیں وہ پہلی لڑکی تھی جس نے بیاہ کے دن سفید لباس کی بجائے سرخ



چھتن (باجرے کے ڈنٹھلوں سے بنی ہوئی چٹائی) پر دو رویہ قطاروں میں عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتوں نے سبز اور سیاہ گن مون (قمیصیں) پہن رکھی تھیں۔ جن کے گھیرے اور گلے سیاہ فیتوں سے سجے ہوئے تھے۔ سروں پر ٹوپیاں اور ٹوپیوں پر چادریں۔ مردوں نے سفید ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے کلکاریاں مارتے پھرتے تھے۔ عورتوں کی اپنی زبان میں زور و شور سے باتیں اور بچوں کا شور مل جل کر ایک ہنگامے کا پتہ دیتے تھے۔

وہ دونوں جب دو گھنٹوں تک ایک دوسرے کا دکھ سکھ سننے کے بعد اپنی دنیا میں واپس آئیں۔ اس وقت دو پہر ڈھل رہی تھی۔ کہف الوریٰ ابھی اس اُلجھن میں ہی تھی کہ اپنے قدموں کو کس طرف موڑے۔ جب پاشا بیگم نے اس کے دائیں ہاتھ کو پکڑا۔ اس کی انگلیوں کو محبت سے دبایا اور کہا۔

''تم میرے ساتھ چلو۔ دو تین دن ہمارے ساتھ رہو اور گندم کی کٹائی کی تقریب اپنی آنکھوں سے دیکھو۔''

اس سیلانی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ اسے مسٹر و مسز داؤد کے تفکر کا احساس ضرور ہوا۔ جو شام تک اس کے گھر نہ پہنچنے کی صورت میں انہیں ہو سکتا تھا اور جب اس نے اس بارے میں اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ پاشا فوراً بولی ''تو گھبراتی کیوں ہو۔ ہمارے ہمسایوں کے گھر سے فون پر بات کر لینا۔''

نالہ شگر پل کے ذریعے پار کیا اور ''ہلپہ پہ'' محلے میں داخل ہو گئیں۔ یہاں ساتھ

ستر گھروں پر مشتمل آبادی تھی۔ بلتستان میں دو منزلہ گھروں کا رواج ہے۔ سردیوں میں گھر کی نچلی منزل استعمال ہوتی ہے، اور گرمیوں میں اوپر کی مویشی وغیرہ بھی نچلی منزل میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ سارا پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ پاشا اسے نشست گاہ میں لے آئی چھرا (بکری کے بالوں سے بنی ہوئی ڈیزائن دار دری) پورے کمرے میں بچھا ہوا تھا۔ سفید گاؤ تکیے دیواروں سے لگے ہوئے تھے۔ نشست گاہ کی سجاوٹ میں پاشا کے ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔

اس نے گاؤ تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندلی تھیں اور صرف یہ سوچ رہی تھی کہ گھر کیسی عافیت کی جگہ ہے۔ لیکن اس کا گھر کہاں تھا۔ اس خطۂ زمین پر شاید کہیں بھی نہیں۔

کھڑکی کی آہنی سلاخوں کے عقب سے پاشا کا چہرہ ابھرا۔ آؤ ''مرزن'' پکنے لگا ہے تم بھی دیکھو۔

وہ اُٹھی اور باہر آ گئی۔ باورچی خانے میں زمینی چولہوں پر بڑے سے پتیلے میں پکنے کے لئے سادہ پانی رکھا ہوا تھا۔ پاشا کی بڑی بھاوج گل بانو بڑی سی سلور کی پرات میں بھنے ہوئے جو کا آٹا لئے پانی کے اُبلنے کا انتظار کر رہی تھی جونہی پانی اُبلا اس نے سارا آٹا اس میں ڈال دیا اور چمچے سے اسے ہلانے لگی۔ یہ حلوے کی مانند بنتا جا رہا تھا۔ پر اس میں میٹھا نہیں تھا۔ نمک تھا۔ اب اس نے اسے بڑی سینیوں میں ڈال کر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیا۔ دیسی گھی گرم کیا اور اسے بھی کٹوروں میں ڈال لیا۔

پاشا نے ایک پلیٹ میں مرزن نکالا اور اسے کھانے کی دعوت دی۔ اس نے گھی میں ڈبو ڈبو کر کھایا اور لطف اُٹھایا۔

ساری شام ہنگامے کی نذر ہوئی۔ چار چار پانچ پانچ عورتوں نے ایک ایک سینی خالی کر دی۔ ساتھ میں بچے بھی ہاتھ کچو لتے رہے۔

اگلی صبح سویرے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دیر تک لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی سے باہر پہاڑوں کو دیکھتی رہی۔ بلتستان کے پہاڑ ننگے بچے روئیدگی کے بغیر بہت پُر ہیبت لگتے ہیں۔

سبزہ صرف وادیوں میں یا جہاں پانی ہو ملتا ہے۔ وہ باغیچے میں اُگے سیبوں کے درختوں پر لٹکے سیبوں کو دیکھتی رہی۔ سرخ ٹماٹروں کو پودوں میں سے جھانکتے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ صبح کیسی پُر نور اور خوشگوار تھی۔ پاشا کے گول مٹول چہروں والے بچے کمبل اوڑھے سوتے تھے۔ تینوں کے سیبوں جیسے رخسار پھٹے ہوئے تھے۔

وہ باہر نکلی بیت الخلا زمینی تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوئی اور باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا۔ گل بانو پراٹھے بنا رہی تھی۔ پاشا کی چھوٹی بہن دوغما (لکڑی کا لمبا سا ڈبہ) میں دہی بلو رہی تھی۔ اس نے بلونے کی کوشش کی پر ہانپ کر جلد ہی بیٹھ گئی۔ بے چاری کو ڈنڈا اوپر نیچے لے جانے میں پسینہ پسینہ ہونا پڑ رہا تھا۔

''چائے کا پیالہ پیو۔'' گل بانو نے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے کہا۔

پاشا نے پیالے میں نمکین چائے ڈالی اور ساتھ ہی تازہ مکھن بھی ڈال دیا۔ پیالہ اس کے ہاتھ میں آیا اور وہ اسے دیکھتے ہی گھبرا کر بولی۔

پاشا یہ تم نے کیا کیا؟ میں اسے نہیں پی پاؤں گی۔

گل بانو زور سے ہنسی۔ پاشا بھی ہنس پڑی۔

''ارے تم اسے پیو تو سہی۔ یہ اتنا لذیذ لگے گا کہ تم ایک اور مانگو گی۔''

واقعی پاشا جو کہہ رہی تھی درست تھا۔ اس نے مزے مزے سے پیا پر دوسرا نہیں مانگا۔

پاشا کے کھیت عظویًا سے ذرا آگے تھے۔ چنار، بید مجنوں اور چیڑ کے درختوں کی ہریالیوں میں بسنتی بالیوں والے پودے کیسے دلکش لگتے تھے۔ بہت سے مرد عورتیں اور بچے تھے وہاں۔ گل بانو نے بچوں اور بڑوں کو میٹھے پراٹھوں کا چپہ چپہ دیا بچوں نے تالیاں بجائیں بڑی بہو کو مبارک باد دی اور گیت گائے۔

تیرا گھر سدا آباد رہے۔

تیرے کھیت کھلیان سدا پھل دیتے رہیں۔

اور تو سدا میٹھی روٹیاں بانٹتی رہے۔

وہاں موجود معمر مرد نے کٹائی کی ابتداء کی اور اس کے ساتھ ہی کٹائی کا عمل شروع ہو گیا۔ تب پاشا بولی۔

''آؤ چلیں۔ اسکول کا بھی چکر لگا آتے ہیں اور مسجد امبوڑک اور چھ برونجی بھی دیکھ آتے ہیں۔''

دو میٹھے پراٹھے جو بچ گئے تھے وہ انہوں نے رومال میں لپیٹے اور چل پڑیں۔ راستے میں اس نے چند ایسے لوگوں کو دیکھا جن کی گردنوں کی ایک طرف پھولی ہوئی تھی یقیناً یہ ''گلہڑ'' تھا۔ اس کے استفسار پر پاشا نے اس کی تائید کی اور بتایا کہ شگر کا پانی صحت کے لیے ناموزوں ہے۔ چند علاقے ایسے ہیں جن میں پانی کی اس خرابی کی بناء پر یہ بیماری عام ہے۔ دراصل طبی نقطہ نگاہ سے اس پانی میں آیوڈین کی کمی ہے۔''

اس کے اس سوال پر کہ آیا انتظامی سطح پر اس خرابی کو دور کرنے کے لیے کچھ کاوشیں بھی ہوئی ہیں یا نہیں۔ پاشا فی الفور بولی تھی۔

''ارے کیوں نہیں، جگہ جگہ ڈسپنسریاں اور اسپتال کھولے گئے ہیں۔ اس بیماری کی خصوصی روک تھام کے لیے ایک میڈیکل سنٹر الگ سے قائم کیا گیا ہے۔ آزادی کی فضا میں سانس لینے والی نوجوان نسل پرانی نسل کی نسبت زیادہ قد آور اور خوب صورت ہے اور اس بیماری سے بھی محفوظ ہے۔

مسجد چھ برونجی میں ایک بار پھر وہ چوب کاری اور پچی کاری اور کشیدہ کاری کے اعلیٰ نمونے دیکھ رہی تھی۔ اس مسجد میں شرقی دروازے سے بسم اللہ شروع کر کے سورہ مزمل جلی حروف میں سفیدی سے تحریر کی گئی ہے۔ یہ مسجد بھی خانقاہ معلی کے ساتھ تعمیر ہوئی تھی۔

یہاں بیٹھ کر انہوں نے وہ دونوں پراٹھے کھائے۔ چشمے کا ٹھنڈا ٹھار پانی پیا چند کچے سیب توڑے اور پھر مسجد امبوڑک کی طرف روانہ ہوئیں۔

یہ مسجد سید امیر کبیر ہمدانی کی یادگار ہے۔ انہوں نے ۷۸۲ء میں اس کی بنیاد رکھی۔ یہی

مسجد ان کا مسکن تھی۔ اسی میں رہ کر انہوں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی پھیلائی۔ مسجد کا گنبد اب قبلہ کی طرف جھک گیا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل حضرت سید امیر کبیر کا عصائے مبارک اس مسجد میں تھا جواب لاپتہ ہے لوگوں کو اس مسجد سے والہانہ لگاؤ ہے۔

یہاں انہوں نے وضو کیا۔ نفل پڑھے اور جب وہ دونوں ہاتھ اُٹھائے دعا مانگتی تھیں پاشا نے بند آنکھیں اچانک کھولتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

''بھلا بتاؤ تم نے کیا مانگا ہے؟''

وہ بھی ہنستے ہوئے بولی۔

پاشاؤ عائیں خالق اور مخلوق کا ذاتی معاملہ ہوتی ہیں۔ یہ بتائی تو نہیں جاتیں۔

تین دن وہ پاشا کے گھر رہی۔ گندم کی گہائی دیکھی۔ سانڈ جیسے پلے ہوئے آٹھ زومو (بیلوں کی ایک قسم) کی گردنوں کو رسوں سے باندھ کر رسے کا آخری سرا ذرا فاصلے پر گڑے رنگ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پول میں لگا رنگ گھومتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زومو بھی گھومتے ہیں۔

''یہ زومو بڑا عیار جانور ہے۔ ذرا نگران آدمی سر سے غائب ہوا اور اس نے کام کرنا بند کر دیا۔''

''ارے انسان بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ آخر کو صحبت کا اثر ہونا ضروری ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

بھوسہ الگ کر کے گندم کو تھیلوں میں ڈالنے کا عمل بھی بڑا پر لطف تھا۔ کام کرنے والوں نے ہونٹوں کو سی لیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ باتیں کرنے سے ان کے درمیان شیطان اور بد روحیں آ جاتی ہیں۔ اناج میں سے برکت اُڑ جاتی ہے۔

اسی شام داؤد صاحب کا ڈرائیور اسے لینے آیا۔ ساتھ چھوٹا سا رقعہ بھی لایا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ آپ کریم صاحب کے ہاں جا کر بیٹھ گئی ہیں۔ گھر آ جایئے سکردو سے فون پر فون آ رہے ہیں۔ سیماں بات کرنا چاہتی ہے۔



رات کے دس بجے سیماں فون پر تھی۔ اس کی کھنک دار رسیلی آواز اس کے کانوں میں یوں ٹپ ٹپ گرتی تھی۔ جیسے قطرہ قطرہ شہد حلق میں گرتا ہو۔ وہ کہتی تھی "آپ کو تو شگر نے معلوم ہوتا ہے چھمی ڈال لی ہے۔ شیبہ بہت اداس ہو رہی ہے۔ للی اور بڑی بھابھی بھی بہت مس کر رہی ہیں۔ پلیز فوراً سکر دو آ جایئے۔"

اور اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"ارے ابھی آ جاؤں۔ سیماں میری جان ابھی تو میں چھپن کلو میٹر طویل بلتر وگلیشیئر کو دیکھنے جانے والی ہوں۔ وہاں سے واپسی پر وادی شگر کے آخری گاؤں ارندو کے سامنے واقع ہسپر گلیشیئر پر سے وہ راستہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ جس پر سے لوگ گلگت کے علاقہ نگر کو جاتے ہیں۔ گزشتہ چند دنوں سے میری گردن پر خارش کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ موٹے موٹے کھرنڈ بن گئے ہیں۔ میں چشمہ چھوترون کے گرم پانی سے اپنی گردن اور سر کو غسل بھی دینا چاہتی ہوں۔ سننے میں آیا ہے چشمہ چھوترون اور اس سے کچھ فاصلے پر چشمہ بلیبل جلدی بیماریوں کے لئے نہایت مفید سمجھے جاتے ہیں۔ میں کے۔ ٹو کی چوٹی کو بھی سر کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اور ہاں سیماں میری جان! کل مجھے داؤد صاحب کے ساتھ "ہشوپی" میں زراعت کا فارم دیکھنے جانا ہے اور ہاں ابھی میں ابھی قلعہ کھرپی ڈونگ کے دہشت ناک محل وقوع کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ڈرنا چاہتی ہوں۔ بھلا سیماں میری جان! اتنے اہم اور ضروری کام جب کرنے والے ہوں تو انہیں ادھورا چھوڑ کر سکر دو کیسے آیا جا سکتا ہے۔"

اور اب ریسیور روح اللہ نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ''میں چاہتا ہوں آپ خپلو کا چکر لگالیں۔ ڈاکٹر سیف اللہ اور اس کی فیملی چند ماہ کے لئے وہاں جا رہے ہیں۔ رہیں شگر کی باتی جگہیں، تو میرا شگری دوست سکندر جو قصور میں ڈی۔ سی ہے۔ وہ دو ماہ بعد اپنے بھانجے کی شادی میں شرکت کے لئے آنے والا ہے۔ یہ سب جگہیں اس کی رہائش گاہ سے زیادہ دور نہیں۔''

اور اب ''چلو ٹھیک ہے'' کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ کوئی ڈھائی بجے سکردو پہنچی۔ اس وقت نشست گاہ میں گھر کے سب افراد بیٹھے کھانا شروع کرنے والے تھے۔ جب اس نے السلام علیکم کہا۔ سیماں کا چہرہ اسے دیکھتے ہی قندھار کے چیرے ہوئے انار کی طرح کھل گیا۔ شیبہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ للی نے بازو اس کے گردن میں حمائل کر دیئے۔ کمرے میں تین افراد اور بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر اسماعیل جو خپلو اسپتال میں ڈینٹل سرجن تھے۔ ان کی نوعمر خوب صورت بیوی اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے ساتھ، اور خپلو اسپتال کے ایم۔ ایس ڈاکٹر ابراہیم۔

اس گھر کے مکینوں نے جس وارفتگی اور والہانہ پن سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے پور پور میں سرشاری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سفر کی ساری تھکاوٹ جو آنکھوں میں اور چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ پل بھر میں اڑنچھو ہوگئی اور جب وہ شیبہ کو سینے سے لگائے قالین پر بیٹھی۔ ڈاکٹر ابراہیم اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''ہم خپلو میں آپ کے منتظر تھے۔''

اس نے ایک نظر اُن پر ڈالی اور سوچا۔

''یہ کیسا چہرہ ہے نرمی اور متانت کی پھوار میں بھیگا ہوا۔ یہ کیسی آواز ہے حلاوت اور محبت کی خوشبو میں رچی ہوئی آپ کو اپنائیت کا احساس دیتی ہوئی۔

وہ ہلکا سا مسکرائی اور بولی۔

''وہیں جانے کے لئے تو آئی ہوں۔''

''شام کو چائے کے بعد وہ لوگ چلے گئے اور جاتے جاتے اسے نجیلو آنے کی پرزور دعوت بھی دیتے گئے۔

رات کو اس نے سیماں کو زہر مہرہ کا خوبصورت ٹی سیٹ دیا جو وہ اس کے لئے شگر سے لائی تھی۔ سیماں نے اس کا گال چومتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے، اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔''

''لو میری تمنا تھی سچ سیماں زہر مہرہ پتھر کی چیزیں۔ قسم سے میرا دل تو سب کچھ سمیٹ لانے کو چاہتا تھا۔ لوگ بتاتے تھے کہ یہ پتھر زہر کا بہترین توڑ ہے۔''

دو دن بعد ڈاکٹر سیف اللہ اور اس کی بیوی نجیلو کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ شگر سے آئی تو وہ اسی نیت سے تھی پر یہاں سیماں ''رپھڑ'' ڈال بیٹھی تھی کہ نہیں ابھی کل آئی ہیں اور آج چلی جائیں، دیکھا جائے گا۔''

سیماں کی محبت اس کے پاؤں کی بھی زنجیر بن گئی تھی۔

شام کو طاہر آیا۔ اسے آنگن میں بیٹھے دیکھا تو قریب آ کر اس کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سنایئے پھر شگر کا دورہ کیسا رہا؟''

''بس ٹھیک ہی رہا۔ وہ کیتھی اور شاور تو روح اللہ نے یہیں سے جدا کر دیئے تھے۔ میرے خیال میں ان کا ساتھ ہوتا تو زیادہ لطف رہتا۔''

طاہر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''ارے شکر کیجئے کہ ساتھ چھٹ گیا۔ ورنہ انہوں نے تو چلا چلا کر آپ کی ٹانگیں تڑوا ڈالنی تھیں اور ''صرف'' کر کر کے آپ کو فاقوں مار دینا تھا۔ اول درجے کی ننگ ملنگ جوڑی تھی وہ۔''

وہ روح اللہ سے کہنے آیا تھا کہ کل سے پولو ٹورنامنٹ شروع ہو رہے ہیں۔ روندو کے کھلاڑی اس بار پھر دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ یہ مقابلے جیتیں گے۔

سیماں بولی "طاہر تم کسی طرح ہم دونوں کو لے جاؤ۔ کہف الوریٰ دیکھ لیں۔

کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر بولا "اچھا دیکھوں گا۔"

اگلے دن وہ لمبی چوڑی چادروں میں لپٹی ناک منہ ڈھانپے پولو گراؤنڈ میں پہنچ گئیں کیا رونق تھی۔ سارا سکردو یہاں سمٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

پہلے چند نوجوان سفید شلوار قمیص، سفید ٹوپیاں، کمر میں سرخ پٹکے باندھے اور ہاتھوں میں تلواریں پکڑے میدان میں اترے۔ لوک دھن "گا شو پہ" پر انہوں نے تلواروں کے ساتھ ایسا دلفریب رقص کیا کہ مجمع کے ساتھ وہ بھی بے خودی تالیاں بجانے لگی اور اس وقت رکی جب سیماں نے ٹھوکا دے کر متنبہ کیا۔

پھر پولو کا کھیل شروع ہوا۔ دونوں اطراف پر پانچ پانچ کھلاڑی تھے۔ کھیل بینڈ کی تیز موسیقی اور مجمع کے ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ شروع ہوا۔ گیند کو مخالف ٹیموں کے درمیان پھینکا گیا۔ ایک سڑاکے کی آواز آئی۔ اس کے پیچھے تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے سوار گیند کو گول کی طرف لے جانے لگے۔ کیا سنسنی خیز کھیل تھا۔ وہ سانس روکے بیٹھی تھی۔ زمین ملیریا کے مریض کی طرح کانپتی تھی۔ بینڈ چیخا۔ ستغرا موسیقی کی گلا ور دھن بجی۔ لوگوں کے واہ واہ کے نعروں سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔

کھیل خطرناک رفتار سے کھیلا جا رہا تھا۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا بس یوں لگتا تھا جیسے ابھی کوئی گر جائے گا اور گھوڑوں کے سم اس کا قیمہ کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔ طاہر نے اس کی کپکپاہٹ کو محسوس کیا اور بولا۔

'لیجئے ابھی تو روندو کے کھلاڑیوں نے میدان میں اترنا ہے۔ آپ کہیں ان کا کھیل دیکھ لیں تو غش کھا کر گر جائیں۔

"باز آئی بابا میں انہیں دیکھنے سے۔" اس نے سہم کر کہا۔

"ارے یہ گھوڑا پولو تو بہت آداب وضوابط کے ساتھ کھیلے جانے والی کھیل ہے۔"

اور جب وہ گھر آ رہے تھے، طاہر بولا۔

''ہمیں بہت شدت سے احساس ہے بلکہ یہ کہتے ہوئے دکھ بھی ہے کہ قومی مظاہروں میں بلتستان کی مصنوعات، رقص وموسیقی اور کھیل نظرانداز کئے جاتے ہیں۔آخر کیوں؟ یہ خون کھولا دینے والا ولولہ انگیز شمشیر رقص اور سنسنی خیز پولو کا کھیل کیا اس قابل نہیں ہیں، کہ انہیں قومی سطح پر روشناس کروایا جائے۔

اور اسے محسوس ہوا تھا جیسے کوئی اس کا دل مٹھی میں بھینچ رہا ہو۔



اُس کا حال پنجرے میں بند کبوتر جیسا ہو رہا تھا جو آزاد ہونے کے لئے طیش میں آ کر بار بار اپنی چونچ لوہے کی سلاخوں پر مارتا ہے۔ ان دنوں وہ اور سیماں کبوتر اور پنجرہ بنی ہوئی تھیں۔ وہ اڑان لینا چاہتی تھی اور سیماں اسے مقید کرنے پر بضد تھی۔ اسے شگر سے آئے ہوئے پندرہ دن ہو رہے تھے۔ ان پندرہ دنوں میں اس نے سیماں کے ساتھ مل کر اس کی سردیوں کی ساری تیاری مکمل کروا دی تھی۔

باغ کے سارے ٹماٹر اتار کر چار چار ٹکڑوں کی صورت میں چھت پر ڈال کر سکھائے تھے۔ سیبوں کو دھو کر سٹور میں بچھی توڑی پر پھیلا دیا تھا۔ دونوں نے سٹور میں ہی وہ جگہ بھی بنالی تھی جہاں مولیوں اور گاجروں کو دبانا تھا۔ ساگ اور پالک سوکھ گئی تھیں، اور انہیں پولیتھین کے لفافوں میں پیک کر لیا تھا۔ سوکھے ٹماٹروں کو بھی ایک دن دونوں نے مل کر پیس لیا۔ یہ سب کام کرتے ہوئے کبھی کبھی اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اسے اپنا گھر یاد آتا۔ اپنا کچن جس کے لئے وہ مہینے کی اولین تاریخوں میں ایسے ہی چیزوں کو سینتے میں پوری گرہستن بنی ہوئی ہوتی۔ دل سے اک ہوک سی اٹھتی اپنے گھر کی آرزو تڑپانے لگتی پھر جیسے یکدم وہ اس آرزو کے گلے میں پھندا ڈال کر اس کا گلا گھونٹ دیتی اور اپنے آپ سے کہتی۔

''بھلا جس راہ نہیں چلنا اس کے کوس کیا گننے۔''

ان دنوں سکردو کی ہر گھر دار عورت سردیوں کی آمد کے سلسلے میں تیاریوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔

ایک شام اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''سنو میں کل ٹیلو جا رہی ہوں۔نہیں جانے دو گی تو چوری نکل جاؤں گی۔''

''اچھا بابا اچھا میں ہاری تم جیتیں۔''

روح اللہ نے ویگن کی فرنٹ سیٹ اس کے لیے ریزرو کروا دی تھی۔سیماں نے چھوٹی سی باسکٹ میں تھرموس اور بسکٹوں کا ڈبہ رکھ دیے۔اس نے کون سے بل بیل جوتنا تھے۔چند جوڑی کپڑے شال اور پل اوور بیگ میں گھسیڑ لئے۔سیماں نے اپنا کوٹ زبردستی اس کے سامان میں رکھ دیا۔اس نے بہتیرا نہ نہ کیا پر وہ بولی ''احمقوں والی باتیں مت کرو بہت سردی ہوگی وہاں۔''

حسین آباد کی پرائمری سکول میں بچوں کو پڑھتے دیکھ کر اسے اپنا بچپن یاد آیا۔بچپن جو پل جھپکتے میں گزر جاتا ہے اور پھر ساری زندگی یادوں کے جھروکوں سے جھانک جھانک کر اپنے وجود کا پتہ دیتا ہے۔

مردوں سے لدی پھندی ایک گاڑی کھرمنگ جا رہی تھی۔تھورگو پڑی کی خطرناک پہاڑیاں جن کے نیچے دریائے سندھ بہتا تھا۔کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔گھبرا کر اس نے پیچھے دیکھا۔ایک معمر مرد اس سے مخاطب تھا۔

بیٹی تم نیچے سے آئی ہو اور میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ان سامنے نظر آنے والی تھور گو پڑی کی پہاڑیوں پر بلتستان نے اپنی جنگ آزادی کی فیصلہ کن جنگ لڑی تھی اور اس لڑائی میں میں خود بھی شامل تھا۔

اس نے رخ پھیرا۔عقیدت واحترام کے گہرے جذبات کے ساتھ اسے دیکھا اور کہا۔

''کیا کچھ تفصیل نہیں بتائیں گے؟''

''بریگیڈیئر فقیر سنگھ عیار دشمن تھا۔مہاراجہ ہری سنگھ کا معتمد خاص اور بہت تجربہ کار فوجی افسر وہ خود میجر کوٹس اور تین سو پچاس فوجیوں اور بے شمار اسلحہ کے ساتھ سکردو پر فیصلہ کن حملے

کے لئے آرہا تھا۔ یہ کمک اگر سکردو پہنچ جاتی تو مجاہدین کے لئے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا۔ مقابلے کے لئے یہی جگہ منتخب کی گئی تھی۔ یہاں وادی بہت تنگ ہے۔ وہ دیکھو اس نے انگشت شہادت سے اشارہ کیا۔ اونچے پہاڑ کی کمر سے گزرنے والے راستے پر ایک وقت میں صرف ایک گھوڑا بوجھ اٹھائے گزر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ نربو چونگ کا گاؤں واقع ہے۔ یٹی اس وقت مجاہدوں کی کمی نہ تھی۔ پورا بلتستان اپنے آپ کو خاک وخون کرنے پر تلا ہوا تھا۔ پر اسلحہ نہیں تھا۔ کیپٹن عالم اور کیپٹن محمد خان نے عمدہ پلاننگ کی فقیر سنگھ ۱۹ مارچ کو دن کے گیارہ بجے میجر کوٹس کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار بمعہ فوج قلی گھوڑے اسلحہ تھورگو پڑی کے پہلو میں واقع میدان میں آپہنچے۔ انہوں نے دوربینیں آنکھوں پر چڑھائیں۔ صورت حال کو موافق پا کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ دوپہر کے کھانے کے لئے دسترخوان سجایا کھانا کھایا۔ شراب سے شغل کیا۔ پھر ہراول دستہ آگے اور پیچھے باقی فوج ترتیب میں چلنے لگی۔ جب ساری فوج پڑی کے بیچ در بیچ راستوں میں آ گئی تو مجاہدین نے ان پر فائرنگ کھول دی۔ پہاڑی کی چوٹیوں سے پتھر برسائے گئے۔ کچھ بھاگے کچھ دریا میں گرے کچھ چوٹیوں سے گر کر ہلاک ہوئے۔ پوری فوج کا صفایا ہوا۔ اسلحہ اور ایمونیشن کا اتنا بڑا ذخیرہ ہاتھ لگا کہ مجاہدین کی ساری مشکلات رفع ہو گئیں۔

نر اور غوڑو کے گاؤں جنگ آزادی کی داستان سنتے گزر گئے۔ نر گاؤں میں ذرائع آمدورفت کے لئے اب بھی زخ (مشکوں اور لکڑی کی ڈنڈوں سے بنی ہوئی کشتی) استعمال ہوتی ہیں۔ دریائے سندھ پر گول کا معلق پل نمودار ہوا۔ یہ معلق پل کرپس سے ہوشے تک جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

گول وادی بہت خوب صورت اور دلکش تھی۔ امام باڑہ ایسی شان والا تھا کہ نظر لگنے کا ڈر محسوس ہوتا تھا۔ دریا کا پاٹ کہیں زیادہ چوڑا اور کہیں کم تھا۔ سڑک بدل گئی تھی۔ روکھے خشک اور بنجر پہاڑوں کے درمیان سے اچانک سبز وادیاں نکل آئیں۔ زندگی اور اس کی رعنائی

کا احساس ابھر آیا۔ ستمبر کا دوسرا ہفتہ تھا۔ ہریالی بتدریج کم ہوتی جاتی تھی۔

کریس سے دریائے شیوق شروع ہو جاتا ہے۔ کریس میں پہنچ کر ویگن چائے پانی کے لئے رک گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ کریس کی شاداب کشادہ چکنی مٹی والی وادی پھیلی ہوئی تھی۔ فصل ربیع کٹ چکی تھی۔ گندم کے کھیت خالی پڑے تھے۔ دور دو ٹریکٹر نظر آئے تھے۔ وہ ویگن سے اتری اور کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈیوں پر چلتی سادات کالونی محلّہ میر پی پہنچ گئی۔ چھوٹی سی کھال پر ایک عورت کپڑے دھو رہی تھی۔ ذرا آگے کھلا سا میدان تھا۔ نوجوان لڑکے گنگ پولو (موجود فٹ بال قدیمی شکل) کھیل رہے تھے۔ سامنے خانقاہ نظر آتی تھی۔ مرادوں کی بار آوری کے نمائندہ رنگ برنگے رومال ہوا سے لہرا رہے تھے۔

وہ ایک دو منزلہ کچے گھر میں جھانکی۔ گھر والی جھاڑ و بہارو سے فارغ ہو کر باورچی خانے میں کچھ پکانے میں مشغول تھی۔ دھوپ کریس کی وادی پر خوب چمک رہی تھی۔ پر خفیف سی خنکی کا احساس پھر بھی تھا۔ اسے دروازے میں کھڑے دیکھ کر پل بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں اجنبیت کی لہر ابھری۔ پھر اس کے حلیے سے اندازہ لگاتے ہوئے کہ کوئی نیچے سے آئی ہے وہ مسکرا دی۔ وہ بلتی میں بولی تھی۔ آگے آؤ۔

وہ کچھ جھجکی اور چولہے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایک بڑی سی طشتری میں اس نے اخروٹ بادام، دھنیا، نمک مرچ وغیرہ کا آمیزہ تیار کر رکھا تھا۔ باجرے کے آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے جنہیں تین انگلیوں سے اٹھایا گیا تھا۔ وہ ابالے ہوئے رکھے تھے۔ اب وہ سب کو ملا رہی تھی۔ اس کھانے کو وہ پڑ دو بتاتی تھی۔ دشواری یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ گھر کا مرد آیا اور اس نے اس مشکل کو حل کیا۔ ایک گاؤں چھوڑ کر اگلے گاؤں اس کی بھانجی کے یہاں ولادت ہوئی تھی، اسے مبارک باد دینے جانا تھا اور یہ کھانے دستور کے مطابق ساتھ لے کر جانے تھے۔

ایک دوسرے تھال میں میٹھے ارزق (سموسے) رکھے تھے۔

اس نے گھڑی دیکھی اور معذرت کرتے ہوئی بھاگی اور جب وہ سڑک پر پہنچی وہاں کچھ نہ تھا۔ سامنے چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھے دو مردوں نے بتایا کہ ویگن والا لڑکا بولتا تھا۔ پتہ نہیں کہاں جا کر بیٹھ گئی ہیں۔ اب میں کہاں تلاش کرتا پھروں؟

اس کا بیگ اور کوٹ ہوٹل والوں کے پاس تھا۔

"کمبخت کہیں کا۔ دیکھو تو کیسا ذلیل کیا ہے۔ اب رات کا کیا بنے گا۔ یہاں کون سی گاڑیوں کی ریل پیل ہے کہ ایک چھٹ گئی تو دوسری مل جائے گی۔"

لیکن اب ''قہر درویش بر جان درویش'' والی بات تھی۔ وہ بلٹی کھیتوں کے عین بیچوں بیچ بیٹھ کر اس نے چائے پی اور بسکٹ کھائے اور اسی گھر کی طرف پھر چلی گھر والے کو اس نے اپنی مشکل بتائی۔ اس نے خلوص بھرے لہجے میں کہا۔

" آپ پریشان کیوں ہیں؟ ہمارا گھر حاضر ہے۔ آپ کریس میں گھومیئے پھریئے۔ دو پہر کو ہم لوگ کونس جا رہے ہیں، ہمارے ساتھ چلئے۔"

اور اب اس کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑی تھی۔

اس نے پڑو پو کھایا۔ ارزق بھی چکھا۔ ارزق کی نسبت اسے پڑو پو زیادہ مزیدار لگا۔ سیب کھائے اور پھر گھومنے پھرنے نکل گئی۔

کریس کے کھیت بہت کشادہ معلوم ہوتے تھے۔ وادی بھی بہت کشادہ نظر آتی تھی۔ چلتے چلتے وہ اس مشہور خانقاہ تک پہنچی۔ جسے کشمیری راہنما سید مختار نے بنایا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے درختوں کے سائے میں شکستہ سی خانقاہ اپنی زبوں حالی کی داستان سناتی تھی۔ وہ اندر گئی اور پھر فوراً باہر نکل آئی۔ سامنے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر وہ بہت دیر تک اردگرد کے ماحول کو دیکھتی رہی۔ پہاڑوں پر برف جمی تھی۔ دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ پتھروں کا ڈھیر سامنے پڑا تھا۔ اور چاروں طرف ویرانی اور اداسی سے بھری ہوئی ہوائیں چلتی تھیں۔

کریس کی جامع مسجد بھی دیکھی جو سید مختار کے والد ابو سعید نے تعمیر کی تھی۔ ایک گھر

کے سامنے ایک بوڑھی عورت کنالی میں خوبانیوں کی بھونی ہوئی کڑوی گریاں سوس (پتھر کی زمینی کونڈی) میں کوٹ رہی تھی۔ اس میں سے اسے چولی مار (تیل) نکالنا تھا۔

یہاں لوگوں کی اکثریت نوربخشی مسلک سے ہے۔

ایک چھوٹے سے گھر میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ بھی اندر چلی گئی۔ یہاں مرگ ہو گئی تھی۔ ساتواں دن تھا۔ رشتہ دار اور میل ملاپ والی خواتین گھر کی عورتوں کا سر دھلانے اور ان میں کنگھی کرنے آتی تھیں۔ گھر کے مردوں نے داڑھی اور سر کے بال منڈ وائے ہوئے تھے۔

مرگ ہو یا ولادت، عزیز و اقارب پکے ہوئے کھانوں کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔

پر جب اس نے میر مختار متوفی کا مقبرہ دیکھا وہ دنگ رہ گئی۔ اس کی چوب کاریاں یقیناً قابل دید تھیں۔

گھومتے گھومتے جب اسے یہ یاد آیا کہ روح اللہ یقیناً شام تک خپلو فون کر کے اس کے پہنچنے کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ خپلو نہیں پہنچی۔ پریشان ہوگا۔ وہ پبلک کال آفس کی طرف بھاگی۔ آپریٹر نے بہت تعاون کیا اور سیماں سے اس کی بات کروادی۔

اب وہ پھر اسی گھر میں پہنچ گئی تھی۔

ایک ٹوٹی پھوٹی جیپ گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ شاید اس میں ہی انہیں جانا تھا۔

''میرے خدایا، ایسا پر خطر راستہ۔ بھلا اگر کہیں اس کی بریکیں فیل ہو جائیں تو پھر۔

تب اس نے اپنے آپ سے کہا ''میری جان زیادہ قیمتی ہے یا ان کی جن کے ساتھ کئی جانیں ہیں۔''

اور اس گھر والی نے جس کے گال سیبوں کی طرح دہکتے تھے، اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔

بچے بھی لد گئے۔ گھر والا ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور جیپ اچھل اچھل کر چلنے لگی۔

نیچے دریائے شیوق بہہ رہا تھا۔ اوپر سورج چمک رہا تھا۔ دائیں بائیں ننگے پہاڑ

جھانکتے پھرتے تھے اور جیپ کھڑ کھڑ کرتی چلی جارہی تھی۔

آگے گون کا گاؤں آیا۔ گھر والا جو عبدالرحیم تھا، اس نے گاڑی ایک طرف رکوائی بیوی سے بلتی میں کچھ بولا اور ایک طرف چلا گیا۔ اس نے پانچویں جماعت میں پڑھتے ان کے بیٹے ناصر سے پوچھا کہ گاڑی کیوں رکی ہے اور اس کا باپ کہاں گیا ہے۔ بچہ بولا تھا۔ گون کے خربوزے اور تربوز بہت شہرت رکھتے ہیں۔ یہ جولائی کا پھل ہے یہاں ایک دکاندار انہیں دو تین ماہ تک رکھتا ہے۔ ہم اگر ان دنوں اس طرف آئیں تو ابا سے فرمائش کر کے ضرور کھاتے ہیں۔

آدھ گھنٹہ بعد جب وہ آیا اس کے ہاتھ میں خربوزہ تھا۔ خربوزہ کم و بیش تین چار کلو سے کم تو کیا ہی ہوگا۔ اس نے ناصر سے غالباً آکر یہ کہا تھا کہ تربوز مل نہیں سکا۔ بچے کا منہ اتر گیا تھا۔

عبدالرحیم نے اسے پتھر پر مارا۔ بیچ میں سے توڑا۔ ٹکڑے کیے اور ایک ایک ٹکڑا سب کو تھما دیا۔

اس نے چکھی کاٹی۔ ایسا ذائقہ دار کہ جنت کے پھل کا گمان گزرا۔ اس میٹھی میٹھی دھوپ میں کھلے آسمان تلے شیوق کے بہتے پانیوں اور پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے یہ سب کھانا اسے بہت اچھا لگا تھا۔

گون کی وادی کے سارے کھیت ایک تناسب کے ساتھ چوکور تھے۔ دریا پار غلبہ کھر کا گاؤں تھا۔ اور تھوڑی دیر میں وہ کونیس پہنچ گئے۔ سڑک سے کوئی بیس گز پر گھر تھے۔ پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آئے۔ گھر میں دو عورتیں تھیں۔ جنہوں نے حیرت سے اسے دیکھا پر جب بلتی میں کھٹ پٹ ہوئی تو ان کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ نمکین چائے کے ساتھ بسکٹ آئے کھانے پینے سے فراغت پا کر اس نے عبدالرحیم سے بات کی کہ اب اس کے پہنچنے کا کیا بندوبست ہوگا۔ اس نے بتایا کہ کل صبح جو گاڑی سکردو سے خپلو کے لئے آئے گی اس پر اسے بٹھا دیں گے۔

اب وہ وہاں بیٹھ کر کیا کرتی۔ بچے کو دیکھا چھوٹا سا بچہ جس پر نظر پڑتے ہی اسے اپنا اندر

ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ دس کا ہرا نوٹ اس نے اس کی گردن پر رکھا اور یہ کہتے ہوئے کہ وہ ذرا گھوم پھر آئے، باہر نکل آئی۔ عبدالرحیم کی آواز اُسے اپنے تعاقب میں آتی سنائی دی تھی" گھر تو یاد رہے گا نا۔"

"گھر تو یاد رہتا ہے۔ کوئی بھولنے والی شے تھوڑی ہے یہ کیسا بھی کیوں نہ ہو؟"

یہ سب اس نے سیڑھیوں سے نیچے اتر کر گویا اپنے آپ کو سناتے ہوئے کہا۔

سڑک کے مین اوپر ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کے باہر کھلی جگہ پر رکھے تھک شا (کمبل ٹیوّ بنانے کا ڈھانچہ) پر ایک نورانی صورت والا بوڑھا نبو بنا رہا تھا، وہ قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں کے ہونٹوں نے دوستانہ مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔ یہ محمد رسول تھا۔ گھر والی خدیجہ بی بی اندر تھی۔ اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ کام چھوڑ کر اٹھا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ گھر کے ایک طرف چھوٹا سا باڑہ تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر چھوٹا سا صحن آیا۔ دھوئیں سے کالا چھوٹا سا برآمدہ جس کی دیواروں میں گڑے تختوں پر سلور کے برتن دھرے تھے۔ خوبانیوں کا ڈھیر باورچی خانے کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ کمرے میں بندھی تار پر گندی مندی رضائیاں لٹک رہی تھیں۔ لکڑی کی چھوٹی سی ڈولی میں چند برتن دھرے تھے کمرہ غربت وافلاس کی دلدل میں سالم دھنسا ہوا تھا۔ گھر والی سیاہ ملگجے کپڑوں میں خستہ حال جائے نماز پر ظہر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ محمد رسول نے تھوڑی سی خوبانیاں ڈولی میں سے نکالیں انہیں پلیٹ میں رکھا۔ پھر سلور کا کٹورہ نکالا، اس کے سامنے رکھا۔ خوبانی کے دو ٹکڑے کیئے اور ان ٹکڑوں کو جو کے خشک آٹے میں لتھیڑ کر کھانے کا عمل اسے سمجھایا اور مزید کھانے کی دعوت دی اور جب وہ کھاتی تھی وہ سوچے چلی جا رہی تھی۔

"پروردگار تو نے میرا دل کیسا بنا دیا ہے ایسے اور اس جیسے سینکڑوں خستہ حال گھروں کو دیکھ کر جلتا ہے۔ کڑھتا ہے۔ لیکن کچھ نہیں کر پاتا۔"

اپنی بے مائیگی کا احساس سانپ کے زہر کی طرح رگ و پے میں اترنے لگتا ہے نس نس جلنے لگتی ہے اور روح تڑپتے تڑپتے نڈھال ہو جاتی ہے۔

اس نے چھ سات خوبانیاں کھائیں اور پھر وضو کے لئے کہا۔ نماز کے لئے جب وہ کھڑی ہوئی۔ تو جانے درد کا ایک ریلا اس کے اندر سے کیوں پھوٹ نکلا۔ ٹپ ٹپ آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ دونوں کے ساتھ باتیں کرنے لگیں۔ محمد رسول کا ایک بیٹا تھا جولا ہور محنت مزدوری کرتا تھا۔ اس ایک بیٹے کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے اور اس کے اس استفسار پر کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔ محمد رسول نے بتایا کہ اوپر پہاڑوں پر ہمارے کھیت ہیں۔ گندم کی کٹائی سے فارغ ہو کر اب کھیتوں میں دوسری فصل بوئی گئی ہے۔

اس نے چھوٹی سی کھڑکی سے جھانک کر سامنے سینکڑوں فٹ اونچے پہاڑوں کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا بھلا ان پہاڑوں پر۔

" ہاں ہاں وہاں پانی ہے۔ زمین ہموار ہے۔ کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ میری بچی ہماری آبادی خوش قسمتی سے سردی کے تین مہینوں میں دھوپ سے محروم نہیں ہوتی۔ اکثر جگہوں پر ترچھی دھوپ اور آبادی کے درمیان اونچے پہاڑ حائل ہو جاتے ہیں جس سے زمین کی زرخیزی متاثر ہونے کے علاوہ اکثر کئی در پودے سوکھ جاتے ہیں۔ یہاں زندگی کس قدر کٹھن ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتی ہو۔ آب پاشی کا دارومدار چشموں، قدرتی اور مصنوعی گلیشیر اور برفانی پانی پر ہے۔ جس کا حصول تیز دھوپ پر ہے۔"

خدیجہ بی بی کہیں جانے کی تیاری میں تھی شاید۔ اس نے پوچھا تو جواب ملا۔ یہ اب اوپر جارہی ہے۔ بہو نے چارہ کاٹ کر رکھا ہوگا نیچے لاتا ہے۔

" میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی" وہ کھڑی ہوگئی تھی۔

خدیجہ بی بی نے کمر پر چورونگ (تیلیوں سے بنی ہوئی لمبوتری ٹوکری) کسی اور ڈاک نے گھوڑے کی مانند تازہ دم نظر آنے لگی۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ پہاڑ کے سینے پر تھوڑا سا بنیہ چڑھتی اور سانس پھول جاتا خدیجہ بیگم ہنستے ہوئے رک جاتی۔

" خدایا یہ زندگی کس قدر کٹھن، کیسی پر آشوب اور کتنی تلخ ہے۔ سامنے دریائے شیوق

ایک پتلی سی لکیر کی صورت میں بہتا نظر آتا تھا۔

کہیں ڈیڑھ گھنٹے میں جب وہ اوپر پہنچی تو دنگ رہ گئی۔ پہاڑوں کے سینے پر سبزہ وگل کے جنگل اُگے ہوئے تھے۔ آدھا کونیس اوپر تھا۔ گندم کٹ چکی تھی۔ کھیتوں میں باجرہ اور کنگنی کے چھوٹے چھوٹے سبز پودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ جھونپڑیاں جن میں دو چار برتن اور ضرورت کی چند چیزیں دھری تھیں۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کھیتوں سے پرے ان پہاڑوں پر جہاں سبزہ تھا اور جھاڑیاں تھیں، چرتی پھرتی تھیں۔ خدیجہ کی بہو اور پوتے پوتیاں اسے دیکھ کر حیرت زدہ سے تھے۔ خدیجہ بیگم کی بہو پھر سے ماں بننے والی تھی۔

اور جب سورج ڈوب رہا تھا۔ وہ سب قلانچیں بھرتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ اس نے سورج کے آتشیں گولے کو دیکھتے ہوئے دو باتیں سوچیں۔ شہر والیوں کے تو کھیر کھاتے پانچ اترتے ہیں، اور یہاں اتنے بڑے پیٹ کے ساتھ اتنی چڑھائی اترائی، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

اب لاکھ اس عورت کو مادی وسائل حاصل نہیں، پر اولاد جیسا خزانہ تو ہے نا اس کے پاس۔



نجلو کے سترو نپی بازار سے آگے پاور ہاؤس کے پمپ سے ذرا اوپر ڈاکٹر سیف اللہ کے گھر پر پڑے بڑے سے تالے کو اس کا جی چاہتا تھا، پاس پڑے بڑے سے پتھر سے توڑ ڈالے۔

بھلا آدمی اتنی دور سے تھکا ہارا آئے اور جہاں آئے وہ غائب ہوں، تو کتنی کوفت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سیف اللہ اور اس کی بیوی دونوں کوئی ایک گھنٹہ قبل چھوڑ بٹ گئے تھے۔ وادی جواری شدید بیمار تھیں وہ اس وقت بھوک سے نڈھال تھی۔ اس کے بال اور چہرہ بلرنگ شور کی ریت اور مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ کھر فق کا معلق پل گزرا۔ دریائے شیوق کے دائیں ہاتھ کھر فق کی وادی گزری۔ اس نے کھڑکی کھول لی اور بس دھول ریت مٹی کے بگولے اڑے اور انہوں نے صورت ہی بگاڑ دی۔

وہاں کھڑے کھڑے دفعتاً اسے ڈاکٹر اسماعیل کا خیال آیا۔ اس نے سوچا چلو وہاں قسمت آزماتی ہوں۔ کسی سے پوچھا۔ اس نے کہا بس یہیں سے اوپر چڑھتی جائیے کبھی دائیں کبھی بائیں۔ کول سے ذرا نیچے ڈاکٹر صاحب کا گھر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے گھر گویا اللہ میاں کے پڑوس میں بنا رکھا تھا۔ وہ جب چلی تو ڈھیر سارے بچے اس کے ساتھ چلنے لگے تھے۔ اسے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ مداری کے تماشے والا بندر ہو، جسے دیکھنے کے لئے بچے بھری دوپہر میں ریوڑوں کی صورت مداری والے کے ساتھ ساتھ اچھلتے کودتے چلتے ہیں۔ اسے عجیب سی کوفت کا احساس ہوا۔ کھڑے ہو کر اس نے

انہیں پیار بھری ڈانٹ پلائی اور بھگا دیا۔ جب مجمع چھٹ چھنا گیا۔ تب آگے بڑھی۔ دو عورتیں اپنے گھر کے آگے خوبانی کی گریاں توڑتی تھیں۔

وہ گھر میں داخل ہوئی۔ برآمدے سے کمرے میں آئی۔ ڈاکٹر اسماعیل کی خوبصورت بیوی سیب کی باریک قاشوں جیسے ہونٹوں پر لالی جمائے مشین کے آگے بیٹھی جانے کیا سی رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھی ہاتھ ملایا۔ اب زبان سمجھنے اور سمجھانے کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔

اس نے پوچھا ''روٹی ہے۔''

جواب ملا ''نہیں۔''

وہ پھر بولی ''تھوڑی بہت دوپہر کی بچی کچھی ہو۔''

اب وہ اسے ہونقوں کی طرح دیکھتی تھی کہ وہ کہتی کیا ہے؟ اس نے مزید گفتگو میں وقت ضائع نہ کیا اور برآمدے میں آ گئی۔ لیکن وہاں پتیلیوں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں اور خالی چنگیر اس کا منہ چڑاتی تھی۔

''میرے خدایا'' اس کا بھوک سے برا حال تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی بیگم اس کے پاس کھڑی پریشانی سے اسے دیکھتی تھی۔ اس نے تھانے دار کی طرح جرح کی۔

''دوپہر کو کیا کھایا تھا؟''

وہ سمجھی اور ٹوٹی پھوٹی اردو اور بلتی میں مفہوم واضح کیا کہ وہ لوگ کسی کے ہاں دعوت پر گئے تھے۔ پھر اس نے فی الفور چائے بنائی۔ بسکٹ رکھے۔ اس نے دو کپ چائے پی۔ سارے بسکٹ کھا کر اسے دیکھا اور بولی۔

''بھابی کچھ سوچنا مت، مجھے شدید بھوک لگی تھی۔''

اور جب عصر کی نماز سے فارغ ہو کر ان کے گھر کی کھڑکی سے نیچے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر اسماعیل چھوٹے بھائی یوسف کے ساتھ اندر آئے۔ سلام دعا کے بعد احوال پرسی

ہوئی۔ نچلو کے لوگ بلتیوں اور شگریوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ پنجاب کے علاقے میانوالی کے لوگوں کی طرح قد آور، مضبوط اور سانولے رنگ کے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی ساخت انہیں تبت سے جا جوڑتی ہے۔

ڈاکٹر اسماعیل کے گورے چٹے بیٹے قالین پر ماں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ ڈاکٹر اسماعیل اس سے ساتھ باتیں کرتا تھا۔ چھوٹا بیٹا کبھی کبھی ہمک کر باپ کی گود میں آ جاتا تھا۔ ایک مکمل اور پُرسکون گھر، پل بھر کے لئے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور پھر گھبرا کر اس نے انہیں کھول دیا۔

رات اضطراب میں کٹی۔ عجیب عجیب سی سوچوں نے بے کل کئے رکھا۔ صبح بہت دیر تک سوتی رہی۔ دن ڈھلے یوسف کے ساتھ سیر کے لئے نکلی۔ اٹھارہ سالہ یوسف جو پنڈی گارڈن کالج سے ایف ایس سی کا امتحان دے کر آیا ہوا تھا، اچھا گائیڈ ثابت ہوا۔

وہ تھوڑا سہمے سے لائی گئی کول کے ساتھ ساتھ تین فٹ چوڑی پٹڑی پر چلنے لگی نچلو کی وادی یہاں سے ایسی دل کش نظر آتی تھی کہ وہ چلتے چلتے رُک رُک جاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ آنکھوں کے زاویے درست رکھے کہ کہیں اس نظر بازی میں دھڑام سے ہزاروں فٹ نیچے ہی نہ گر جائے۔ پر نظارے یوں لپک لپک کر دامن تھامتے تھے کہ وہ بے بس ہوئی جاتی تھی۔ ان کے سروں پر جو پہاڑ تھے اس پر نچلو گلیشیئر ہے۔ اس میں سے ایک نالہ نکلتا ہے جو وادی میں پہنچ کر نچلو شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ نچلو بالا اور نچلو پائین۔

یوسف بہت اچھا گائیڈ تھا۔

سامنے یبگو راجاؤں کا قدیمی محل نظر آتا تھا۔ دریائے شیوق چاندی کی ایک لمبی لکیر کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ حضرت سید امیر کبیر ہمدانی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی تاریخی مسجد چقچن بھی نظروں کے سامنے تھی۔ شاہ بلوط کے پتے ہواؤں کے جھونکوں سے ٹوٹتے تھے۔

نیچے اسے پولو گراؤنڈ نظر آتا تھا۔ محل سے ملحق ڈنس محلے میں چھتوں پر کوئی عورت نظر آتی تھی۔ جب وہ محل کے اندر جانے والی سڑک پر آئی۔ پتھروں کی دیوار پر سے جھانکتے

ہوئے کچے پیلے رنگ کے بڑے بڑے پھولوں نے اسے خوش آمدید کہا۔

سورج جلدی جلدی بلند پہاڑوں کے عقب میں روپوش ہو رہا تھا۔ چشمے کا پانی شور مچاتا تھا۔ اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔

محل کے اندر جانے سے قبل اس نے ان جگہوں کو دیکھا جو مسلح گارڈوں کے بیٹھنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ تین گز کا فاصلہ طے کرنے کے لئے انسانی قدموں کو چار بار روکا جاتا تھا۔ اس کی چشم تصور نے ان راہوں پر ایک غریب باری کی سُنے ہوئے افسانوں سے جو گت بنتے دیکھی۔ وہ اس کے حساس وجود کو جھرجھری دلانے کے لئے کافی تھی۔ سامنے چھوٹا سا باغ تھا جس کے عین درمیان میں روش پر چلتے ہوئے وہ ترک نسل کے۔ بگو راجاؤں کے اس رہائشی محل کے سامنے کھڑی تھی۔ جہاں وہ انگریز لڑکی مارجوری بلز راجہ افتخار کی دلہن بن کر آئی تھی اور جس نے اسی محل میں "ڈولا آئے اور جنازہ اٹھے" والے محاورے پر اپنی جان نثاری استقامت اور محبت سے مشرق کی اجارہ داری ختم کر ڈالی تھی۔

رخ پھیر کر چار سیڑھیاں پھر چڑھی اور محل میں داخل ہوگئی۔ یوسف پیچھے تھا۔ اور اسے اُس وقت کی سنی سنائی کہانیاں بتا رہا تھا۔ جب یہاں کوئی پَر نہیں مار سکتا تھا۔ محل شکستہ ضرور تھا لیکن اس کی حالت شگر اور سکردو کے محلوں سے کافی بہتر تھی۔ بیسیوں کمرے جو کشمیری معماروں اور فن کاروں کے فن کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

جاروق (راجہ کے بیٹھنے کی جگہ) ویران تھا۔ دیواروں اور ختم بند (چھت) کا نفیس کام بتاتا تھا کہ یہاں بیٹھنے والا کیسا ہوگا۔ ان کمروں سے نچلو بالا اور نچلو پائیں سارا نظر آتا تھا۔ محل کے چاروں طرف باغات ہیں۔ یوسف باغ میں بیٹھ گیا تھا اس نے دیکھا تھا ان باغات میں ایسے ایسے پھول تھے جو اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھے تھے یوسف بتا رہا تھا، یہ کشمیر کے پودے ہیں۔

پرانے محلے کے سامنے جدید طرز کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ نیا محل کہلاتا ہے۔

اس محل کا ایک حصہ لاک تھا۔ برآمدے کی دیواروں پر حنوط شدہ مارخور اور ہرنوں کے

سرلٹک رہے تھے۔

عقبی کمروں میں جب وہ جھانکی، راجہ فتح علی خان کی بیگم حلیمہ خاتون فرش پر بیٹھی شلجم کے بیج صاف کرتی تھی۔ چھوٹی بیٹی زیب النساء چشمے کے پانی سے کپڑے دھورہی تھی۔ اور اس سلونی شام کو سارا محل سکون اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔



بس تو منظر وہی نظارہ تھا۔ شام کے گھنے بادلوں میں جب دفعتاً بجلی چمکتی ہے اور ارد گرد کا سارا ماحول روشن ہو جاتا ہے۔ اس وقت جب وہ پرانے محل کی بیرونی سیڑھیوں سے چھلانگیں مارتی ہوئی اس کچی جگہ پر آ کر ٹھہری تھی جس کے مشرقی طرف نیا محل اور اس سے ملحقہ چھوٹا باغیچہ، غربی طرف بڑا باغ اور بیگم فتح علی خاں کے کمروں کی طرف جانے کا راستہ۔ عقب میں پرانا محل اور شمال میں مزید سیڑھیاں اور شکستہ کمرے تھے۔ بس یہیں اسی کچی جگہ پر کڑکتی بجلی اشکارے مارتی تھی۔

بڑی بڑی آنکھوں کے پٹ پھاڑے وہ اسے دیکھتی تھی۔ جس کے گھناؤں جیسے سیاہ بال کانوں کے پاس دو چوٹیوں میں تیز گلابی پشم کے پراندوں میں گندھے کمر پر جھول رہے تھے۔ تائیوان کا چھوٹے چھوٹے پھولوں والا مہندی رنگا سوٹ جس کی شلوار کے پائینچوں تلے ایرانی پلاسٹک کا جوتا، نہایت خوب صورت پاؤں مقید کئے کھڑا تھا۔ اس نے ہیرے دیکھے ہوئے تھے۔ پر لعل نہیں۔ اسی لئے وہ آنکھوں سے پھوٹتی شعاعوں کو کوئی نام نہ دے پا رہی تھی۔

''کون ہیں آپ؟'' شکستہ اُردو میں اس سے پوچھا گیا۔

''میں ایک سیاح ہوں، جسے وطن کی یہ دل کش وادیاں اپنے نظاروں سے محظوظ کرنے کے لئے کھینچ لائی ہیں۔''

''اور آپ؟'' اس نے جواباً استفہامیہ نگاہیں اس پر جما دیں۔

اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کی تنی گردن کچھ اور تن گئی تھی جب اس نے یہ جواب دیا تھا۔

''میں شاہ جہاں اس محل کی بہو رانی۔''

اور اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یوں لگتا ہے، جیسے آپ کا نام بہت عجلت میں رکھا گیا تھا یا پھر اس پہ کسی نے غور و خوض کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ دراصل آپ تو نور جہان ہیں۔''

اب اس کے ہنسنے کی باری تھی۔ وہ ہنسی اور دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''تو آئیے پھر آپ کو چائے پلائیں اور راجہ فیملی سے ملوائیں۔''

شاہ جہاں نے یوسف سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اب جائے اور یہ کہ ان کا نوکر اسے چھوڑ آئے گا۔

سارا خاندان بڑے کمرے میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ راجہ کھرمنگ کی والدہ فاطمہ بیگم گزشتہ دنوں محل میں ہونے والی ایک شادی میں شرکت کے لئے ھرمنگ سے آئی ہوئی تھیں۔ بھتیجے بھتیجیوں اور بھاوج نے بصد اصرار انہیں روک لیا تھا۔ عنابی ویلوٹ کے سوٹ میں وہ کس قدر پُر تمکنت دکھائی دیتی تھیں۔

حسین ماضی ان کی آنکھوں سے چھلک چھلک پڑتا تھا۔ اس نے ان میں جھانکا اور پوچھا۔

''آپ کو حال کتنا تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے؟''

''اب تو عادی ہو گئے ہیں میرے بچپن اور جوانی کا اوائل سری نگر میں گزرا جہاں ہم لوگ تعلیمی سلسلے میں مقیم تھے۔ شادی کے بعد کھرمنگ میں رہی۔ بس وقت گزر گیا۔

شاہ جہان پلیٹ میں امبہ خوبانیاں لائی۔ سفید اور قدرے خشک خوبانیاں۔

وہ کھاتی گئی اور مہارانی کھرمنگ کی باتیں سنتی گئی۔ پھر چائے آ گئی۔ نمکین چائے۔

رانی نحیلو ایک مورت کی مانند سامنے بیٹھی تھیں۔ ہلکے ہلکے گھونٹ سے چائے پیتے

ہوئے اس نے مارجوری بلز کی منجھلی بہو کو دیکھا جو گود میں بچے کو سلاتی تھی۔

باہر شام اتر آئی تھی۔ ستمبر کے دوسرے ہفتے کی ٹھنڈی ہوائیں سارے میں دندناتی پھرتی تھیں۔ شاہ جہاں اور وہ باہر نکل آئی تھیں۔

چیڑ کی لکڑی کے تختوں سے بنی راہداری جس کے چوبی جنگلے پر کہنیاں ٹکائے وہ اپنے سامنے جھاگ اڑاتے شفاف پانی کے چشمے کو شور مچاتے بہتے دیکھ رہی تھی۔ کچھ پیلے رنگ کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ناک میں گھس کر عجیب سی لطافت پیدا کرتی تھی۔

دفعتاً اس نے شاہ جہاں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اس عروج و زوال کے المیے میں تمہاری سوچیں کیا ہیں۔''

اور اس کی طرف دیکھے بغیر کہف الوریٰ کو محسوس ہو گیا تھا کہ وہ ہنسی ہے اور اس ہنسی میں دکھ یاس اور پسپائی نمایاں ہے۔ وہ بولی تھی۔

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، خاک اڑتی ہی دیکھی ہے۔ ہماری ماؤں پھوپھیوں کا زمانہ تھا جب یہاں جاگیرداری عروج پر تھی۔ اب تو بس سننے کو کہانیاں ہیں۔ جنہیں مجھ جیسی کہانیاں سمجھتی ہے اور میری ماں پھوپھیاں اور ساس اپنا قیمتی اثاثہ۔

پھر جیسے اس کے اندر سے دکھ کا ایک لاوا پھوٹ نکلا۔ وہ اس کی طرف جھکی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برف پر سے آتی ہواؤں کی ٹھنڈک کو بازو اور سینہ سکیڑ کر پرے کرتے ہوئے وہ بولی تھی۔

''ہماری زندگی ایک المیہ ہے شاید تم اسے محسوس نہ کر سکو۔ میرے بھائی کزن اور رشتہ دار لڑکے خوابوں کی اس جنت میں رہتے ہیں۔ جو ان کے آباؤ اجداد کی تھی۔ لیکن جس سے وہ نکالے گئے ہیں۔ یہ نوجوان لڑکے بدلتے ہوئے حالات اور حقائق کا سامنا کھلی آنکھوں سے کرنے کی بجائے انہی خوابوں میں گم ہیں۔ یقیناً تمہیں علم نہیں ہوگا کہ میرا شوہر ناصر راجہ فتح علی خان کا بیٹا نچلو میں ایک معمولی اسکول ماسٹر ہے۔ راجہ سکردو کا چھوٹا بھائی میرا کزن گلگت میں

کانسٹیبل ہے۔ جب کہ ہمارے ملازموں اور ان کے بچوں نے ان بدلتے ہوئے حالات کو سمجھ کر ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ سب آج اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔"

دونوں بہت دیر چپ چاپ اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبی رہیں پھر اس نے کہا۔ "اچھی چچی مارجوری بلز کے متعلق کچھ نہیں بتاؤ گی؟"

"سامنے دیکھو" اس نے انگشت شہادت سے دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھ رہی ہوں، بولو۔"

سینکڑوں فٹ اونچے اس پہاڑ پر اس کی نظریں جم گئیں۔

اس پہاڑ پر نیلو کا تاریخی قلعہ اور محل "تھور سے کھر" تھا۔ قلعہ تو کھنڈر بنا پڑا ہے۔ مگر اس کی مسجد جوں کی توں ہے۔ کسی دن وہاں چلیں گے اور تمہیں مارجوری بلز کی وہ کہانی سناؤں گی جس کے بغیر کوہ قراقرم کی تاریخ نامکمل ہے۔"

"خدایا! یہاں کے لوگ انسان نہیں جن لگتے ہیں۔ عمودی چٹانوں پر جگہ جگہ قلعے اور محل بنا رکھے ہیں۔"

اس نے سہم کر ایک بار پھر اس سینکڑوں فٹ اونچے پہاڑ کو دیکھا جو ایک دیوہیکل جن کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا اور جس پر "تھور سے کھر" کا شکستہ قلعہ اور محل واقع تھا۔ اور جہاں جا کر وہ بُت طناز اسے وہ داستان سنانے کا کہہ رہی تھی۔ جس کے بارے میں تاریخ بھی گواہ ہے۔

"یہ تم بلتی لڑکیوں کی کیا بری عادت ہے کہ فضا میں معلق ہوئے بغیر تم کوئی قصہ کہانی سنا ہی نہیں سکتی ہو۔ اسے سیماں یاد آ گئی تھی جو ملکہ، مینددق کھر کا قصہ سنانے کے لئے اسے قلعہ کھرپوچو لے کر گئی تھی۔

"لو چچی اور افسانے سے زیادہ دل کش کہانیوں کی تم اتنی سی قیمت نہیں دے سکتی ہو کہ خود چل کر ان جگہوں کو دیکھو جو اسے بہت محبوب تھیں۔ پہاڑ کے عقب میں ہماری زمینیں ہیں۔ چچی مارجوری ان دنوں اوپر ضرور جاتی تھیں۔

مغرب کی اذان نے گفتگو کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔ اس نے چادر سر پر اوڑھی اور نماز کے لئے چل دی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب اس نے کہا۔

''سنو ڈاکٹر اسماعیل میرا انتظار کرتے ہوں گے مجھے واپس بھجواؤ اب۔''

اور وہ پری جمال ایک ادا سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اس اندھیری رات میں اس وقت تم نے باہر نکل کر کیا اپنی ہڈیاں گوڈے گٹے تڑوانے ہیں۔ اور ہاں دیکھو، دوستی کر لی ہے میں نے تم سے۔ بھول جاؤ اب ڈاکٹر اسماعیل کو جتنے دن چلو رہو گی میرے پاس رہنا ہوگا۔ میرا نوکر ڈاکٹر اسماعیل کو بتا آیا ہے۔



دھوپ پہاڑوں کی چوٹیوں سے دھیرے دھیرے نیچے پھسلتی آ رہی تھی۔ شاہ بلوط، چنار اور پھلدار درختوں پر سے ہوتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں آ کر سیدھی اس کے چہرے سے ٹکراتی تھیں۔ شاہ بلوط کے پتے گاہے گاہے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرتے تھے۔

وہ اس چوڑی فصیل پر چوکڑی مارے بیٹھی تھی۔ جو محل اور ڈنس محلے کے درمیان حد فاصل تھی۔ دائیں بائیں پرانا اور نیا محل، سامنے پہاڑ اوپر نیلا آسمان اور نیچے جہلو بالا بکھرا پڑا تھا۔ کشادہ راستے پر کبھی کبھی کوئی بوڑھی عورت کمر پر کسی چوروٹنگ کے ساتھ نظر آتی۔ شاہ جہاں کی دونوں لڑکیاں چوبی جنگلے کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ لوگ ان دنوں سرما کے انتظامات میں منہمک تھے۔ ایندھن اور کھانے پینے کی چیزوں کو اکٹھا کیا جا رہا تھا۔

گھروں کی چھتوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ دھواں زندگی کی علامت ہے اور اس کے ساتھ گھردار عورت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

عین اسی وقت اس نے سامنے سے دو سوٹڈ بوٹڈ مردوں کو آتے دیکھا۔ جب انہوں نے محل کی طرف آنے والے راستے کا موڑ کاٹا تو پہچان کی زد میں آ گئے اس نے جانا تھا، ایک ڈاکٹر اسماعیل اور دوسرا غالباً ڈاکٹر ابراہیم تھا۔

اب دونوں نے اُسے فصیل پر یوں چوکڑی مار کر فراغت سے بیٹھے دیکھا تو ہنس پڑے۔ قریب آنے پر ڈاکٹر اسماعیل نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا۔

''آپ نے اچھی ایکٹیویٹی کی اس دن۔ میں مرغ پلاؤ پکوائے بیٹھا آپ کا انتظار کرتا

رہا۔آپ یہاں دھرنا مار کر بیٹھ گئیں۔''

وہ ہنسی اور بولی۔

''کمال ہے ڈاکٹر صاحب دوپہر کو آپ نے مجھے ہڑپ کھور پر ٹرخا دیا تھا، اب مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ نے مرغی بھینٹ چڑھادی ہے۔اچھا تو آپ اوپر آیئے۔''

''نہیں بھئی اوپر آنے کا اب وقت نہیں آپ سے ملنا تھا۔ڈاکٹر ابراہیم آپ کو دوپہر کے کھانے کے لئے کہنے آئے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب کے گھر میں تو کوئی عورت نہیں ہے۔کھانا کون بنائے گا؟ اور خوش آمدید کون کہے گا۔''

اب شاید ڈاکٹر ابراہیم کے بولنے کی باری تھی۔وہ بولے۔

''آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے۔''

''ڈاکٹر صاحب! میں بڑی بدبخت لڑکی ہوں آم بعد میں کھاتی ہوں، پیڑ پہلے گننا چاہتی ہوں؟''

''چلئے ہم آپ کو پیڑ بھی گنوادیں گے تو آپ آرہی ہیں نا؟''

اور وہ پھر ہنسی۔

''اتنا بڑا ڈاکٹر دعوت دینے آیا ہے انکار تو کفرانِ نعمت ہوگا۔''

اور جب وہ دونوں چلے گئے۔وہ ناشتے کے لئے شاہ جہاں کے کمرے میں آئی جہاں نوکر نے اسے خوبانی کے رس والا گرم گرم پیالہ تھمایا۔جسے گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اس نے شاہ جہاں کو دونوں ڈاکٹروں کی آمد اور دوپہر کے کھانے کی بابت بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے۔

''جان ہماری بات وہ ہے کہ رسی جل گئی ہے پر بل ابھی تک نہیں گئے۔گو سب کچھ ختم ہوگیا ہے پر ہماری آن بان ابھی باقی ہے۔ڈاکٹر ابراہیم جیسا ہمدرد اور نفیس انسان بہت کم

دیکھنے کو ملتا ہے میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد جب وہ چائے پی رہی تھی، شاہ جہاں نے دفعتاً پوچھا۔

''تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ تم آخر کس غرض کے لئے ان علاقوں میں گھوم پھر رہی ہو؟''

''سیاحت میرا شوق ہے۔ میں اپنے وطن کا چپہ چپہ دیکھنے کی متمنی ہوں۔''

اور شاہ جہاں اپنی خوبصورت آنکھوں کو اس پر مرکوز کرتے ہوئے شرارت سے ہنسی۔

''بس تو خیال رکھنا، ڈاکٹر ابراہیم ایک بہترین انسان بھی ہے اور رنڈوا بھی۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اگر تم ایک بلتی سے شادی کرلو۔''

''شاہ جہاں کوئی عقل کی بات کرو۔ آؤٹ کیوں ہوگئی ہو؟'' جب اس نے یہ بات کہی تھی، اس کے لبوں پر ایک ایسی معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی تھی جسے یقیناً شاہ جہاں جیسی تیز طرار عورت بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔

دوپہر کو ڈاکٹر ابراہیم کا نوکرا سے لینے آیا۔ کٹے بالوں کی سرکش لٹوں کو اس نے پنوں میں جکڑا۔ سیاہ چادر کی بکل ماری اور اس کے پیچھے پیچھے چلتی پولو گراؤنڈ پہنچی۔ وہاں سے نچھی محلّہ میں داخل ہوئی۔

ڈھلان سے اترتی ہوئی اسپتال آگئی۔ خپلو کا سول اسپتال درختوں کے جھنڈوں میں گھرا تھا۔ دونوں ڈاکٹر اس کے استقبال کے لئے باہر برآمدے میں تھے۔ جیپ میں بیٹھنے سے قبل وہ بولی۔

''ڈاکٹر صاحب! اب یہ جیپ لے کر اگر آپ مجھے لینے آجاتے تو کچھ حرج تھا کہ ڈھائی تین میل کی اترائی نے میری بھوک کو تین گنا کر دیا ہے۔ آپ کے کھانے کی کچھ بچت ہو جاتی۔''

ڈاکٹر ابراہیم عین اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولے۔

''آپ فکر مند کیوں ہیں۔ کھانا کم پڑا تو میں اپنا حصہ بھی آپ کو کھلا دوں گا۔''

اس بار اس نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبالی تھی اور متانت سے کہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب میں غاصب نہیں ہوں۔''

گھر پر مسز اسماعیل، ڈاکٹر ابراہیم کی بڑی بہن اور بھاوج نے اس کا استقبال کیا۔

''دیکھ لیجئے ہم نے کتنے پیڑوں کا بندوبست کر رکھا ہے۔''

کھانا خاصا پُرتکلف تھا۔اس نے دیکھ کر کہا۔

ڈاکٹر صاحب! کوئی بلتی ڈش بھی بنوا لیتے۔

ڈاکٹر ابراہیم ہنس پڑے۔

''دراصل میں آپ کی طعنہ بازی سے کچھ خوفزدہ ہو گیا تھا۔''

اب ان کا ملا جلا قہقہہ وہاں گونجا۔

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ڈاکٹر ابراہیم نے اس سے کچھ ذاتی باتیں پوچھیں جن میں سے کچھ کے جواب اس نے دیئے اور بقیہ گول کر گئی۔

ڈاکٹر اسماعیل نے اسے اپنے گھر چلنے کو کہا۔لیکن وہ معذرت کرتے ہوئے بولی۔

ڈاکٹر صاحب شاہ جہاں مجھے اور میں اُسے کمبل کی طرح چمٹ گئے ہیں۔آپ نے ریچھ اور کمبل کی کہانی تو سنی ہوگی۔اس کے استفسار پر جب انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تب اس نے کہا۔جس دن چلو سے جاؤں گی، اسی دن ساتھ چھٹے گا۔

اور جب وہ واپسی کے لیے جیپ میں بیٹھی ڈاکٹر ابراہیم نے کہا۔

''کیا خیال ہے آپ کو مسجد چقچن اور خانقاہ معلی نہ دکھاتے چلیں۔''

''نیکی کرنا چاہتے ہیں اور پوچھتے بھی ہیں۔''

جیپ اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر تیزی سے دوڑتی ہوئی پتھروں کی دیوار کے پاس جا کر رک گئی۔

درخت کے ساتھ چھوٹا سا دروازہ تھا جو غالباً حجرہ لگتا تھا مسجد چقچن زمین کی سطح سے

بہت اونچائی پر بنائی گئی ہے۔ درختوں کے پتے ہواؤں سے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرتے تھے۔ ٹنڈ منڈ ہونے میں بس تھوڑے دن باقی تھے۔ راستے کے دائیں بائیں پہلوؤں میں بنی ہوئی بڑے بڑے دروازوں والی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں جن کے سروں پر مسجد جتھن یوں چمکتی تھی۔ جیسے ٹاٹ میں بروکیڈ کا پیوند۔ محرابوں والے دروازے کے اندر داخل ہو کر گویا وہ آرٹ کی دنیا میں داخل ہوگئی تھی۔ آرٹ کے وہ نادر شاہکار جن کے نام موج حیدر، موج اصغر اور موج حسین تھے۔ سب یہاں موجود تھے۔

شہرہ آفاق انگریز مورخ جان ہارلے نے اسی مسجد اور خانقاہ معلٰی کے بارے میں کہا ہے کہ یہ اپنی طرز تعمیر کی بنا پر ایشیا کی خوب صورت ترین مسجد ہے۔ دونوں کی تعمیر حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے اپنے ہاتھوں سے ہوئی۔

خانقاہ معلٰی کی چوب کاریاں بھی دیکھنے کے قابل تھیں۔ چھت، یونگ دروں آرٹ کے نمونوں سے سجی کھڑکیاں موج حیدر آرٹ کی عکاس.....

وہ گیند کی طرح برآمدوں اور کمرے میں لڑھکتی پھری۔ اس کی آنکھیں اتنے خوب صورت شاہکار دیکھ دیکھ کر پھٹی جاتی تھیں۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس نے بہت سی سورتیں پڑھیں اور دعا مانگی۔ اور جب اس نے آنکھیں کھولیں، ڈاکٹر ابراہیم اس کے پاس کھڑے اسے دیکھتے تھے۔ وہ مبہوت سی ہوئی۔ اس کے کان تانبے کی مانند سرخ ہوگئے اور وہ تیزی سے ایک طرف ہو کر چھت کی حسن کاری کو دیکھنے میں محو ہوگئی۔

اور باہر نکل کر اس نے کہا۔ ''میرے خیال میں بلتستان کا پرانا آرٹ اب صرف چپلو میں ہی زندہ ہے۔''

اور جب انہوں نے اسے محل کے باہر اتارا۔ ڈاکٹر ابراہیم نے کہا ''کسی دن اسپتال میں آئیے نا۔''

''انشاءاللہ'' کہتے ہوئے وہ جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہوگئی۔

شاہ جہاں نے اس پر نظر پڑتے ہی ہنس کر کہا۔

"خوب ٹھونسا ٹھونسی ہوئی ہوگی۔"

"وہ تو ظاہر ہے ہوئی تھی۔ چلو تمہارے رات کے کھانے کی بچت ہوگئی۔"

جب رات ڈھلی تو نئے محل کے بڑے کمرے میں راگ ورنگ کی محفل بجی۔ مار جوری بلز کی بہو کی آواز ایسی لوچدار کہ وہ کنگ سی ہوگئی۔ محمد حسین ہوشے کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ اس نے بزمیہ دھن بجائی۔ ساز والے نے بلتی دیوان (نیم کلاسیکل موسیقی) بجایا اور اس کمرے میں وہ گیت گونجا جو شاہ جہاں کے سسر راجہ فتح علی خان کے چچا دولت علی خان کی بیوی لداخی شہزادی گاتی تھی۔

واسکت ہندرلہ سکسے ناتھونمو خلا پولو یتگ تھون

شہر فیو لو یتگ ہلتیکنا اتا منگمو ے سو مید

اے میرے دولت علی خان، میرے ان عزیزوں کی عمریں بھی تجھے لگ جائیں جواب مجھ سے بہت دور ہیں)

میں نے جب مڑ کر دیکھا (ہندر کی طرف) تو وہاں پکے سیب نظر آئے۔

جو سیب میں کھا نہ سکوں وہ اگر سوکھ بھی جائیں تو مجھے کیا

میں نے جب مڑ کر دیکھا (ہندر کی طرف) تو وہاں گلاب کھلے نظر آئے۔

جو گلاب میں اپنے بالوں میں سجا نہ سکوں، وہ اگر سوکھ بھی جائیں تو مجھے کیا غم اور جب رات کا دوسرا پہر بیت رہا تھا۔ وہ اس گیت کا پس منظر سن رہی تھی۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میرے سسر راجہ فتح علی خان لداخ کے شاہی خاندان نمگیل کی ایک شادی میں شرکت کے لئے ہندر گئے تھے۔ ہندر شہر دریائے شیوق اور نوبراہ کے سنگم پر واقع ہے۔ شاہی خاندان بدھ مت کا پیرو تھا تقریب کے دوران دولت علی خان نے ایک

حسین وجمیل شہزادی دیکھی۔ وہ بس ایسی ہی تھی جیسے پتھر کی ایک مورتی۔ دولت علی خان پہلی نظر میں دل ہار گیا۔ نجلو واپس پہنچ کر اس نے باپ سے کہا کہ شادی کروں گا تو نمگیل شہزادی سے ورگرنہ جان دے دوں گا۔ باپ نے رشتہ بھیجا جو منظور ہوا۔ وہ شہزادی کو بیاہ کر نجلو لایا۔

نجلو پہنچ کر اس نے اسلام قبول کیا اور نہایت متقی اور پرہیز گار خاتون بنی۔ جب وہ بہت اداس ہوتی تو محل کی بالکونی میں بیٹھ کر اپنا منہ لداخ کی طرف کرتی۔ اپنی سکھیوں اور عزیزوں کو یاد کرتی اور اپنے شوہر دولت علی خان کو دعائیں دیتی اور یہی گیت گاتی تھی۔

اور جب رات کا تیسرا پہر بیت رہا تھا۔ باہر تیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے تھے۔ اندراس کے رخساروں پر آنسو بہتے تھے۔ اور وہ اپنے آپ سے پوچھتی تھی۔ کل کے مرد کی محبت لازوال تھی یا عورت ہی ایسی جانثار تھی کہ اپنے پرانے وجود کو ملیامیٹ کر کے نئے ماحول کے مطابق نئے وجود کی بنیاد رکھتی تھی۔ اور آج کی عورت اپنی ذات کا بٹوارہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور پھر اس نے اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے دیر بعد سوچ سوچ کر خود کو اس کا جواب دیا۔

''ارے آج کی عورت بھی کرتی ہے۔ پر جب کوئی محرومی دامن کے ساتھ ہو تو حساس ذہن ٹکڑے ٹکڑے ہونا گوارہ کرتا ہے۔ لیکن سمجھوتا تو بس کی بات نہیں رہتی۔



وہ اس وقت بانکپن وجاہت، دلآویزی اور حسن و جمال کے آخری زینے پر کھڑا تھا۔
سچی بات ہے راجہ افتخار نجلو کے بیگو خاندان کی انگوٹھی کا وہ بیش قیمت ہیرا تھا۔ جس کے بغیر انگوٹھی دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ تُرک نسل کی ساری خصوصیات اس کے روپ میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ پڑھنے کے لئے ان دنوں سری نگر میں مقیم تھا۔

شاہ جہاں اور وہ دونوں ''تھور سے کھر'' کی شکستہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ دریائے شیوق کا پانی سورج کی کرنوں نے چاندی بنا دیا تھا جو یوں چمکتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ نجلو بالا اور نجلو پائین کے گھر گڑیوں کے گھروندے معلوم ہوتے تھے۔ ہنجور اور کالدق کی سیرگاہیں زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعوں کی صورت میں نظر آتی تھیں۔ گنگچھے گلیشئر اور اس میں سے نکلتا نالہ سب یہاں نمایاں تھے۔

صبح فجر کے بعد وہ رضائی میں دبک کر سو گئی تھی۔ رات دونوں کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ صبح ''تھورے سے کھر'' پر چلنا ہے۔ لیکن نماز کے بعد اس کی نیت میں فتور آ گیا اور وہ یہ کہتے ہوئے سو گئی کہ دفع کرو کل دیکھا جائے گا۔ پر نو بجے کے قریب شاہ جہاں نے اس کے سر سے رضائی کھینچ کر کہا۔

''کچھ خوف خدا کرو چلنا نہیں کیا؟ ڈیڑھ گھنٹہ چڑھائی میں لگے گا۔ ادھر گاؤں میں بھی جانا ہے۔''

''ارے دفع کرو شاہ جہاں کل چلیں گے۔ آج تم مجھے بلے پکا کر کھلاؤ۔''

''احمق ہو کہیں۔'' اس نے رضائی گھسیٹ کر پرے کر دی۔

شاہ جہاں پن چکی کی طرح دھن کی پکی تھی۔ جو بات ایک بار طے کر لی بس اس میں ردوبدل کا کوئی سوال نہیں۔

اس نے چھوٹی بیٹی کمبل میں لپیٹ کر چور ونگ میں لٹائی اور اسے کمر پر لادا۔ چائے کی بوتل پراٹھے، انڈے، پانی کی بوتل دوسری ٹوکری میں ڈالے اور وہ اس کی کمر پر کسنے لگی۔

''شاہ جہاں تم نے یہ من پکا وزن مجھ پر لاد دیا ہے۔ اگر کہیں میرا پاؤں رپٹ گیا تو یاد رکھنا خون تیری گردن پر ہوگا۔''

اور اس چلبلی نار نے تیکھی نظروں سے اُسے گھائل کرتے ہوئے کہا۔

اوکھلی میں سر بھی دیتی ہو اور موسل سے بھی ڈرتی ہو۔ وطن کے دشوار گزار حصے دیکھنے کا شوق بھی ہے اور راستے کی صعوبتوں سے خوف زدہ بھی ہو۔ چلو سیدھی طرح۔ تمہارے کون سے مرنے کے دن ہیں۔ دنیا تھوڑی پڑی ہے اس نیک کام کے لئے۔''

فضا میں اچھی خاصی خنکی کے باوجود اس کا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ پہاڑ ایسا عمودی جب وہ آنکھ کی خفیف سی جھری سے دائیں بائیں دیکھتی تو لمحے بھر کے لئے اس کا خون جیسے رگوں میں منجمد ہو جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسے موت اس کے تعاقب میں ہے۔

اور ''تھورے کھر'' پر پہنچ کر جب اس نے کمر سیدھی کی اور ارد گرد دیکھا تو غصے سے بولی۔

''تف ہے تم پر۔ تم سیماں سے پاپا سنگ بھی کم نہیں ہو۔ وہ کمبخت مجھے کھر پوچولے کر پہنچی تھی اور تم یہاں لے آئی ہو۔ ارے یہاں ہے کیا؟ مار دیکھ کر کلیجہ جلتا ہے۔ سارے سر میں دکھ اور یاس گھلتا ہے۔ زوال کی کہانیاں دل کو ڈسنے لگتی ہیں۔ بندہ اسباب و علل کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔''

شاہ جہاں مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے اس زمانے میں چھلانگ لگا دی جب اس کا چچا راجہ افتخار علی خان سری نگر کا ہار سنگار تھا۔ کالج ہاسٹل اور پورے سری نگر میں اس کے حسن و جمال

کے چرچے تھے۔

یہ ایک رنگین شام تھی۔ چناروں کے پھولوں نے فضاؤں اور دلوں میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ بارش ابھی ابھی برسی تھی۔ فضا میں بادلوں کے ٹکڑے یوں تیرتے پھرتے تھے جیسے جھیلوں کے نیلگوں پانیوں میں گلیشیئر کے چھوٹے چھوٹے تودے۔

راجہ افتخار نے اٹیلین کیفے کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتی قامت پر گہرا نیلا سوٹ، سرخ نکٹائی اور سیاہ چم چم کرتے جوتے۔ دروازہ کھول کر وہ جس انداز میں اندر آیا تھا اور بیروں نے جھک کر جس طرح اسے تعظیم دی تھی، وہ پرنس آف ویلز نظر آتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ واقعی جہلم کا لاڈلا شہزادہ تھا۔

مارجوری بلز ابھی کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے سکاٹ لینڈ سے ہندوستان آئی تھی۔ مدراس میں اپنے عزیزوں کے پاس ایک ماہ گزارنے کے بعد ابھی ایک ہفتہ قبل سری نگر اپنی پھوپھی مسز ولیم کے پاس آئی تھی۔ اس وقت وہ کیفے کے ایک کونے میں کافی سے دل بہلاتی تھی اور ہلکی ہلکی موسیقی پر پاؤں کی انگلیاں جوتوں کے تلے سے قالین پر بجاتی تھی۔ جب اس نے افتخار کو آتے اور میز کے گرد بیٹھتے دیکھا۔

افتخار کے ساتھ اس کے جگری یار غلام وزیر مہدی (سابق ممبر مجلس شوریٰ) اور سلطان ڈوپٹہ آف کشمیر تھے۔ مارجوری اپنی سیٹ سے اٹھی۔ اُنکے پاس پہنچی اور افتخار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ عظیم برطانیہ کے کس حصے سے ہیں؟''

افتخار بڑا شوخ وشنگ نوجوان تھا۔ اس نے مسکراہٹ کو جو اس سوال پر فی الفور اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی، دبا لیا۔ اور اس کی سبز آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

''بھلا آپ کو کہاں کا لگتا ہوں؟''

مارجوری نے اس کی نیلی آنکھوں کو بغور دیکھا اور بولی۔

''سکاٹ لینڈ کا۔''

''کمال ہے محترمہ۔'' سلطان ڈوپٹہ آف کشمیر فوراً بولا۔ میں نے برطانیہ کا ایک ایک شہر دیکھا ہے۔ اس جیسا یوسف لاثانی تو وہاں ایک بھی نہیں۔ بھئی یہ ہندوستانی مسلمان ہے۔''

''اوہو'' کہتے ہوئے مارجوری پیچھے ہٹی۔ پر اوہو کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ میں نے ایسا حسین مرد آج تک نہیں دیکھا۔

اور غلام وزیر مہدی نے افتخار کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا اور بولا۔

''چلو اب لونڈیا عاشق ہوئی۔''

مارجوری اس وقت بالی عمریا کے دور میں تھی۔ سبز آنکھیں گویا شراب کے چھلکتے پیالے تھے۔

اگلے دن جب افتخار پھر کھیلنے گیا۔ مارجوری اپنی پھوپھی مسز ڈیلم کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ مسز ڈیلم نے افتخار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور ہونٹوں کو عین گولائی میں لاتے ہوئے بولی۔

''ہاؤ ڈوشنگ۔ مارجوری نے کل رات اور آج کا سارا دن تمہارا ذکر کر کے میرے شوق اور جذبہ تجسس کو شدید کر دیا تھا۔ میں سمجھتی ہوں مارجوری تعریف کرنے میں سو فیصد حق بجانب تھی۔''

اب ہوا یہ......اور اس سے آگے کہانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

شاہ جہاں کی بیٹی جاگ گئی۔ اس نے اسے اٹھا کر گود میں لٹایا اور دودھ پلانا شروع کر دیا۔ اس نے سر پر چمکتے سورج کو دیکھا۔ جب وہ نیچے تھی تو یہ دیوتا ''تھور سے کھر'' کی چوٹی پر معلق معلوم ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جونہی وہ چوٹی پر پہنچے گی اسے ہاتھ بڑھا کر دامن میں دبوچ لے گی۔ لیکن وہ تو اب پھر اُتنا ہی اونچا تھا۔

دھوپ میں حرارت ضرور تھی پر ٹھنڈی ہوائیں اس حرارت کو زیادہ موثر نہیں رہنے دیتی تھیں۔

اس نے کپڑا پھیلایا۔ انڈے پراٹھے نکالے اور کھانا شروع کیا۔ اس جگہ کھانا کھانے کا اپنا ایک لطف تھا۔ شاہ جہاں نے جب چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا تب سلسلہ پھر جڑا۔

اب ایک گھمبیر مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ نجیلو کے اس حسین شہزادے کی محبت کے دو دعویدار پیدا ہو گئے۔ بھتیجی کے ساتھ اس کی پھوپھی مسز ولیم جو افتخار کو سالم نگل جانا چاہتی تھی۔ جو اس کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں پکڑ کر جھٹکے دیتی اور کہتی۔ ''افتخار تم اب تک کہاں تھے۔ مجھے پہلے کیوں نہیں ملے۔ ہائے افتخار تم نہیں جانتے۔ ہاؤ آئی لو یو۔''

افتخار کے لئے یہ صورت حال انتہائی ناپسندیدہ تھی۔ وہ فلرٹیشن کے سخت خلاف تھا۔

ایک دن جب مسز ولیم کسی اہم کام کے سلسلے میں جھوں گئی ہوئی تھی۔ مارجوری افتخار سے ملنے آئی۔ افتخار نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑا اور بولا۔

''مارجوری تمہیں اس ترقی یافتہ آسائشوں سے پُر ماحول سے بہت دور ایک پسماندہ علاقے میں جہاں زندگی کی بیشتر سہولتیں نہیں رہنا ہوگا کیا تم رہو گی؟''

مارجوری کی آنکھیں شدت احساس سے بھیگ سی گئیں اُسنے گھو گیر لہجے میں کہا۔ ''میں رہوں گی۔''

افتخار نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا، اپنے سینے سے لگایا اور بولا۔

''مارجوری! تمہیں اپنا مذہب تبدیل کرنا ہوگا، کیا تم کرو گی؟''

اور اس نے اس کے سینے پر اپنا سر مارتے ہوئے کہا۔

''کروں گی، افتخار میں کروں گی۔''

تب افتخار جھکا، اس کی پیشانی پر طویل پیار کیا اور بولا۔

''مارجوری تمہیں پردہ کرنا ہوگا، کیا کرو گی؟''

''سب کچھ کروں گی، تم کہو گے تو آگ میں کود جاؤں گی۔''

اور افتخار ہنستے ہوئے بولا۔

''آگ میں نہیں، جہلو کے محل میں کُود نے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

اور اسی شام، افتخار نے اپنے جگری یاروں کی مدد سے مار جوری کو اغوا کیا اور ایک ہاؤس بوٹ میں رکھا۔ غلام وزیر مہدی کی ڈیوٹی لگی کہ وہ اُسے مسلمان کرے اور ارکان اسلام کے بارے میں بتائے۔

پھر نکاح ہوا۔ اس کا اسلامی نام فاطمہ صغرا تجویز ہوا۔ گواہوں میں سلطان ڈوپٹہ آف کشمیر اور وزیر مہدی تھے۔ ایک دن وزیر مہدی جو اسے قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ انہوں نے پڑھاتے پڑھاتے دفعتاً پوچھا۔

''تو جب آپ جہلو چلی جائیں گی تو ہم سے کیا پردہ کریں گی۔''

اور اس نے متانت سے کہا۔

''اس کا انحصار تو افتخار کی مرضی پر ہوگا۔ اب مار جوری بلز تو رہی نہیں، فاطمہ صغرا ہے، جو شوہر کی اجازت کے بغیر قدم نہیں اٹھائے گی۔''

پندرہ دن بعد جب مسز ولیم لوٹ کر آئی اور بھتیجی کو غائب پایا، اس نے آفت مچادی جیسے اسے پتہ یقین تھا کہ اسے غائب کرنے میں افتخار کا ہاتھ ہے۔ انگریز لڑکی غائب ہو جائے اور طوفان نہ اٹھے۔ طوفان اٹھا، پر اس طوفان کے اٹھنے سے پہلے افتخار اسے سری نگر سے لے بھاگا۔ جس شب انہیں سری نگر سے چلنا تھا، مار جوری کے ہونٹ نیلے پڑے ہوئے تھے اس کی آنکھوں میں وحشت وخوف کے سائے رقصاں تھے۔ کیونکہ اسے پتہ چلا تھا کہ مسز ولیم نے کہا ہے، میں اسے پاتال سے کھینچ لاؤں گی۔ وہ جاتی کہاں ہے؟

پر مسز ولیم اور اس کے حواریوں کی آنکھوں میں اس گھوڑے کے سموں کی گرد اُڑاتی ہوا کا ایک ننھا سا گولا بھی نہ پہنچا۔ جس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر وہ کرگل کے راستے کھرمنگ پہنچی تھی۔

ہماری پھوپھی فاطمہ بیگم نے لاڈلے بھائی اور بھاوج کو کھرمنگ بیامہ میں اپنے سہ منزلہ رہائشی محل میں ٹھہرایا۔

''کیسے دن تھے وہ بھی۔'' شاہ وجہاں نے افق پر نظریں جماتے ہوئے سلسلہ جاری رکھا۔

''میری زیزی (ماں) بتاتی تھیں کہ ہمارے دادا یعنی بڑے راجہ صاحب کو معلوم ہوگیا تھا کہ بیٹا ایک انگریز چھوکری بھگائے لا رہا ہے۔ جوانی کے منہ زور گھوڑے پر وہ پند و نصائح کی کاٹھی ڈالنے کے خلاف تھے۔ اب جب وہ اسے قبول کر بیٹھا تھا تو بلاوجہ ہنگامہ آرائی کا فائدہ؟ اس صبح وہ جاروق میں بیٹھے تھے، انہوں نے اپنے بڑے بیٹے فتح علی خان کو پکارا۔ جب وہ ان کی پکار پر اندر آیا، تب انہوں نے کہا۔

''اپنی والدہ سے کہو دلہن کے لئے بلتی لباس تیار کروائیں۔''

پھر جب بکسوں کی تہوں میں سرسراتے ریشمی کپڑے نکلے اور ان کی کتر بیونت شروع ہوئی تو سارا محل راگ رنگ میں ڈھل گیا۔

سازندوں نے محل کے سامنے چھوٹے لان میں ''تھین کار'' کی چھ دھنیں بجائیں، اور دو دو آدمیوں نے مل کر رقص کیا۔

کھرمنگ سے وہ پالکی میں بیٹھی اور گنگچے گلیشیئر کے اوپر سے ہوتی ہوئی خپلو میں اتری سارا خپلو اس وقت پولو گراؤنڈ میں جمع تھا۔ رعایا نے ہاتھوں میں تھالیاں پکڑی ہوئی تھیں جن میں ان کی حیثیت کے مطابق نذرانے تھے۔

اس وقت ''سنیوپا'' کی دھنیں بجنی شروع ہوئیں اور سات مردوں کا تلوار کے ساتھ رقص کا آغاز ہوا۔ جب کہاروں نے پالکی پولو گراؤنڈ کے سامنے رکھی تھی۔ پالکی کے پردے اٹھائے گئے۔ وہ اندر سے نکلی۔ پولو گراؤنڈ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس نے رعایا سے تحائف وصول کئے ان کی دعائیں لیں۔

اور جب اس نے محل میں قدم رکھا۔ وہ افتخار کے قدموں میں جھکی تھی۔ اس نے اس کے پاؤں کو چھوا اور بولی۔

''افتخار، میری زندگی اب تمہارے نام رقم ہوئی۔''



وہ دیوار سے ٹیک لگائے اس سارے عمل کو غایت دلچسپی سے دیکھتی تھی۔ پرانے محل کے ایک کمرے میں صاف فرش پر ان چار آدمیوں نے جو" براہ" سے آئے تھے، خوبانیوں کی گٹھلیوں کی دونوں بوریوں کو زمین پر پھیلا دیا تھا۔ چاروں نے اپنے منہ پانی سے بھرے اور اُن پر پچکاری کی۔ یوں کہ جیسے پنجاب کی دیہی عورتیں کچے صحنوں میں جھاڑو سے قبل پانی کا چھڑکاؤ کرتی ہیں۔ جب ان کے خیال کے مطابق نمی ان میں سرایت کر گئی۔ تب انہوں نے گول پتھر ہاتھوں میں پکڑے۔ گھٹنے زمین پر لگائے، جھکے اور انہیں توڑنا شروع کر دیا۔ کمرے میں توڑ پھوڑ کی آوازوں میں ایک مربوط ہم آہنگی تھی۔ جلد ہی گشتوں کے پشتے لگ گئے۔ تبھی ملازم آیا اور بولا۔

"نیچے جیپ میں ڈاکٹر ابراہیم آئے ہیں۔ آپ کو بلاتے ہیں۔"

اس نے کمرے سے نکل کر فصیل سے نیچے جھانکا۔ جیپ میں ڈاکٹر ابراہیم کے گھٹنے اور سٹیرنگ پر رکھے بازو نظر آتے تھے۔ وہ سیڑھیاں اتر کر سامنے آئی۔ ڈاکٹر ابراہیم نے جیپ کی کھڑکی سے چہرہ نکال کر اسے دیکھا۔ اسے محسوس ہوا تھا۔ ان آنکھوں میں محبت اور شفقت کے لطیف سے جذبات گھلے ہوئے ہیں۔

"آپ ٹھیک ہیں؟ سردی کی شدت سے گھبرا تو نہیں گئیں۔

اور اس نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک تو نہیں۔ آگے کا کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

پتہ نہیں اس کے دل میں اٹھنے والا یہ سوال ''کہ آپ کیسے آئے؟'' اس کی آنکھوں میں فی الفور کیوں عود آیا تھا، اور ڈاکٹر ابراہیم بھی آنکھوں کی زبان پڑھنے میں شاید بڑے ماہر تھے۔ تبھی فوراً بولے۔

''دراصل میں فارغ تھا اور بور بھی ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا آپ کو کالدق کے سیر گاہ بروک دکھالاؤں۔''

وہ اس پیش کش کا فوری کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ کچھ گومگو کی کیفیت تھی۔

اور ڈاکٹر ابراہیم نے اس کے دل میں جھانک لیا۔

''آپ کس بات سے ڈرتی ہیں؟''

وہ خجل سی ہوئی اور تیزی سے بولی۔

''ڈاکٹر صاحب ڈرنا کیسا؟ اچھا میں آتی ہوں۔''

وہ مڑی ضرور، پر اس کا ایک ایک قدم جو اٹھا، وہ سوچ کا غماز تھا۔ سیڑھیوں کا ایک ایک زینہ جس پر اس نے پاؤں رکھا، اندیشوں سے پُر تھا۔ جب وہ کمرے میں آکر کھڑی ہوئی اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''کیا کروں اب؟''

اور جیسے اس کے اندر سے آواز آئی ''کرنا کیا ہے جاؤ۔''

اس نے جرابیں اور بوٹ بدلے، کوٹ پہنا گرم سکاف سر پر باندھا۔ باہر نکلی۔ شاہ جہاں پرلی طرف کمروں میں بخاریاں فٹ کروا رہی تھی۔ وہاں جانے اور اسے بتانے کی بجائے اس نے صرف نوکر کو بتایا۔ اور پھر نصف سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے دفعتاً اپنے آپ سے سوال کیا۔

''خدایا میں کندن بننے کی خواہش مند ہوں۔ یا راکھ ہو جانا چاہتی ہوں۔''

اور پھر وہ کسی بھی واضح فیصلے پر پہنچے بغیر جیپ تک آ گئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر بیٹھنے سے قبل اس نے دیکھا۔ ڈاکٹر ابراہیم اُسے دیکھتے تھے۔ گھبرا کر اس کا ہاتھ سٹیئرنگ پر پڑا۔

جیپ نشیب میں اُترنے لگی تھی۔ راستے میں سیدھے سادے مرد عورتیں بوڑھے بچے ڈاکٹر صاحب کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کرتے جاتے۔ وہ ایک ہاتھ سے انہیں جواب دیتے جاتے۔ وہ شیشے سے باہر دیکھتی تھی۔ وہی پہاڑ، ٹنڈ منڈ درخت۔ وادیٔ ہنزہ کا سارا حسن ماند پڑا ہوا تھا۔ شاہ بلوط ننگے ہو گئے تھے اور کھیتوں میں سبزہ بہت کم تھا۔

''آج آپ کو میں پورے ہنزہ کا ایک چکر لگواؤں گا۔''

جیپ ایک خانقاہ کے سامنے سے گزری۔ دروازے پر اس نے کراس卐 کا نشان دیکھ کر پوچھا۔

''یہ نشان میں نے کم و بیش ہر مسجد، خانقاہ اور قدیم محلوں قلعوں ہر جگہ دیکھا ہے۔ کیا اس کی کوئی خصوصی اہمیت ہے؟''

''جی ہاں۔'' ڈاکٹر ابراہیم نے جیپ محلہ کرامنگ میں داخل کرتے ہوئے کہا۔

اس نشان کو بلتی زبان میں یونگ دُرونگ کہتے ہیں۔ یہ زمانہ قدیم سے متبرک نشان کے طور مستعمل رہا ہے۔ بدھ مت کے دور میں ایک سفید کپڑے پر گندم کے دانوں سے یہ نشان بنا کر دولہا اور دلہن کو اس پر بٹھاتے تھے۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ان دونوں کی مشترکہ زندگی کی ابتداء گندم اور اس نشان کی امن وسلامتی اور بابرکت علامت سے ہو۔

محلہ کرامنگ کے میدان میں شہتوت کے ٹنڈ منڈ درختوں پر ایک نیلا کبوتر بار بار چکر کاٹتا پھرتا تھا۔

اب ڈاکٹر ابراہیم اسے بتا رہے تھے کہ یہ ہیتھچی محلہ ہے۔ اس کے عین اوپر ہنجور کی آبادی ہے ہنجور میں بڑے بڑے قطعہ زمین تھے۔ جن پر گندم کی کاشت ہوتی تھی۔

''مشہور سلتر گلیشیئر اور مشہ بروم کی چوٹیاں بھی اسی علاقے میں ہیں کبھی کسی گلیشیئر کو

دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟'' اُنہوں نے پوچھا تھا۔

''میدانی لوگ ان کوہستانی رعنائیوں سے کہاں واقف ہوتے ہیں۔ کنگچھے گلیشیئر کا تھوڑا سا جلوہ دیکھا ہے وہ بھی دور سے۔ بس برف کا سمندر نظر آیا تھا۔''

واپسی پر قریبی گاؤں براہ چلیں گے۔ وہاں ماہی پروری کے محکمہ نے ٹراؤٹ مچھلیوں کی افزائش نسل کے لئے مرکز قائم کیا ہے۔ وہ بھی دیکھنا اور ٹراؤٹ مچھلی بھی کھانا۔ دنیا کی کوئی مچھلی ذائقے اور لذت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

وہ اب ہنجور کی نہر پر پہنچ گئے تھے۔ کالدق کی سیر گاہ ہنجور کی سیر گاہ کے ساتھ واقع ہے۔ ان سیر گاہوں میں سیر و تفریح کا حقیقی لطف موسم بہار میں آتا ہے۔ جب درخت اور میدان سبزے کا پیرہن پہن لیتے ہیں۔ اس وقت وہاں سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ ٹھنڈی ٹھار ہوائیں تھیں۔ خشک گھاس اور ٹنڈ منڈ جھاڑیاں، اودے پہاڑ پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ بعض کھیتوں میں کنگنی اور ترنبہ بوئے ہوئے تھے۔ کئی کھیتوں میں باجرہ کی کٹائی کر لی گئی تھی۔ لوگوں نے چارہ محفوظ کر لیا تھا۔

دونوں ایک ابھرے ہوئے بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ چائے کے تھرموس میں سے جب ڈاکٹر ابراہیم نے دو کپ بھرے۔ ایک اسے تھمایا اور دوسرا خود لے لیا۔ وہ ہنس کر بولی۔

''چائے پینے کا صحیح لطف بھی یہیں آتا ہے۔''

اور جب وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتی تھی، سامنے پہاڑوں کو اور اردگرد کی دنیا کو دیکھتی تھی، اور اپنے حسابوں شراب دو آتشہ کے مزے اٹھاتی تھی۔ ڈاکٹر ابراہیم نے کہا۔

''آپ کو اس سیر گاہ کے بارے میں ایک روایت سناتا ہوں جو بہت مشہور ہے۔''

''کہتے ہیں ایک بوڑھا شخص جس کا نام ینگ چونگ تھا۔ بڑا ہمت والا، نہایت جفاکش اور بہت پرعزم تھا۔ ایک دن یونہی اس کے جی میں آئی کہ کالدق کی اس بنجر اور ویران جگہ کو قابل کاشت بنایا جائے۔ اس نے ہنجور کی نہر سے ایک رابطہ نہر بنائی۔ اس نہر کی تعمیر میں اس

نے صرف اپنی لاٹھی اور نوکیلے پتھروں سے کام لیا۔ نہر مکمل ہوئی کالدق کو قابل کاشت بنایا گیا۔ جب یہاں گل و گلزار ہوا تب اس نے راجہ سیر چونگ کو اپنے گھر پر دعوت دی اور پھر اس نے اس خوبصورت جگہ کے نصف جگہ حصے کو تحفے کے طور پر راجہ سیر چونگ کو پیش کیا۔''

اور جب اس نے چائے کا دوسرا کپ بھرا اور اسے ہونٹوں سے لگایا۔ بس تو اس سے اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ لمحے جن میں مقید وہ وہاں بیٹھی ہے، دائمی ہیں۔ ماضی کہیں نہیں ہے اور مستقبل کا بھی کوئی وجود نہیں لیکن ان احساسات کی عمر کتنی تھی۔ بس چند لمحے۔ تبھی ڈاکٹر ابراہیم نے کہا۔

''کہف الفوریٰ اگر کچھ کہوں تو۔''

اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ اپنے سامنے بیٹھے اس نرم خو شخص کو دیکھا جو مہربان اور شفیق تھا۔ جس کی آنکھوں میں اس کے لئے پسندیدگی کی گہری جھلک تھی۔ جسے زندگی بھر کے لئے ایک اچھے رفیق کی ضرورت تھی۔

اور جیسے اس کا دل رنج والم سے بھر گیا اور یہ دکھ اندر سے اس کی آنکھوں کے راستے باہر بھی چھلک پڑا اور جب اس نے یہ کہا۔

''ڈاکٹر صاحب کچھ مت کہیے۔ کبھی کبھی خاموشی کے بھرم میں ہی عافیت ہوتی ہے۔''

بس تو ضبط کا بند ٹوٹ گیا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

اور جب ڈاکٹر ابراہیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کہف الوریٰ۔''

اس آواز میں دکھ کی آمیزش تھی جس نے اسے تڑپا دیا۔ دکھ اور غم کے گہرے میں پانیوں میں اُتر کر سب کچھ بھول جاتا ہے کچھ یاد نہیں رہتا۔ اسے بھی اگر کچھ یاد تھا تو اپنے دکھ، جنہوں نے اسے زار زار آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایسے میں اسے وہ آواز بھی سنائی نہیں دی تھی جس نے اسے بار بار کہا تھا۔

’’کہف الوریٰ کچھ تو کہو۔ کہنے سننے سے انسان ہلکا ہو جاتا ہے۔‘‘

اسے تو یہ بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ کب وہ ڈاکٹر ابراہیم کے بازوؤں کے حلقے میں آ گئی تھی۔ کب اس کا سران کے شانے پر پڑا گھائل ہوا جاتا تھا اور وہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے چلے جاتے تھے۔

’’تم نے اتنی سی عمر میں کون سے دُکھ پال رکھے ہیں؟ کچھ تو بتاؤ۔‘‘

ٹھنڈی ہوائیں کالدق میں دندناتی پھرتی تھیں۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے چلا گیا تھا اور ڈاکٹر ابراہیم کا شانہ اس کے آنسوؤں کے رواں پانیوں سے بھیگا جاتا تھا۔



ساری رات وہ بخار میں یوں بھنتی رہی تھی جیسے بھٹی میں وانے۔ سانس لینا نزع کی سنگینی جیسا دشوار تھا۔ واپسی پر ڈاکٹر ابراہیم نے بہتیرا اسے کہا کہ کسی طرح وہ رات کا کھانا اس کے گھر کھالے۔ پر وہاں "ایک چُپ سو کو ہرائے۔" والی بات تھی۔ سو ہار کر وہ چُپ رہے۔ پر جب وہ اتری وہ بھی ساتھ ہی اترے۔ یہ چاندنی رات تھی اور چاند بھی پورا تھا۔ سارا جہلو بالا، محل اور پہاڑ اس چاندنی میں چمکتے تھے۔ ڈاکٹر ابراہیم نے عین اس کے سامنے آ کر کہا۔

"مجھے دکھ ہے کہ میں اس درد کو نہ جان سکا جو تمہارے سینے میں سرطان کے پھوڑے کی طرح پل رہا ہے کیف الوری ہم ایک دوسرے کے دکھ نہ بانٹ سکیں۔ انہیں ہلکا نہ کر سکیں۔ ان کا حتی الامکان مداوا نہ کر پائیں تو ہم پر انسان ہونے کی تہمت ہے۔"

اس نے بس ایک نظر انہیں دیکھا۔ اتنا بہت سارا رو چکنے کے بعد اب آنکھیں خشک تھیں اور ان میں دکھوں کے جو سائے لرزیدہ تھے، وہ اس چاندنی میں بھی ڈاکٹر ابراہیم کو نظر آتے تھے۔

پھر وہ مڑی اور جب وہ دروازے سے گزر کر سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی، اس نے دیکھا شاہ جہاں کے کمروں میں بتی جلتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ کسی سے ہونٹ کھول کر ایک لفظ بات کرنے کی روادار نہ تھی۔ اس کے زخموں کے بند منہ کھل گئے تھے۔ اور ان میں سے درد کی لہریں نکل رہی تھیں۔

صبح جب وہ نو بجے تک کمرے سے باہر نہ نکلی۔ شاہ جہاں مارے فکر کے بھاگی بھاگی

آ ئی۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ یوں جلا جیسے دہکتے تنور میں گر پڑا ہو اگھبرا کر باہر بھاگ گی۔ رانی ماں کو خبر سنائی وہ بھی پریشان بھاگتی آ ئیں نوکر نیچے اسپتال دوڑایا۔ ڈاکٹر ابراہیم اور ڈاکٹر سیف اللہ بھاگے آئے معائنہ کیا تو معلوم ہوا ڈبل نمونیے کا حملہ ہوا ہے۔ اسی وقت جیپ میں بٹھا کر اسپتال لے آئے۔

دس دن وہ اسپتال میں داخل رہی اور ڈاکٹر ابراہیم نے دن رات ایک کر دیا۔ سیماں کا کئی بار فون آیا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ روح اللہ اسلام آباد گیا ہوا تھا اور وہ خود سفر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

اس نے دل کے دروازوں کو دھکے لگا لگا کر کنڈیاں چڑھانے اور انہیں مکمل بند کرنے کی امکانی کوششیں کیں۔ لیکن باہر خلوص اور محبت کی جو آندھیاں ڈاکٹر ابراہیم کے وجود کے ساتھ چل رہی تھیں۔ وہ اس کی سب کاوشوں کو ناکام بنائے جاتی تھیں۔

وہ چپلو سے اب بھاگ جانا چاہتی تھی۔ آنے والے برف باری کے دن وادی جواری اور غلام حیدر کے پاس چھور بٹ میں گزارنا چاہتی تھی۔ اس شام جب شاہ جہاں اس سے ملنے آئی، اس نے اپنا ارادہ اس پر ظاہر کیا۔

''نہیں۔'' وہ مضبوط آواز میں بولی ''میں تمہیں اس کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی۔''

''مت دو۔ اجازت میں صرف اپنے آپ سے لوں گی۔''

''دیکھو کیوں اپنی جان کی دشمن بنتی ہو۔ آخر تم کہتی کیوں نہیں جو تمہارے اندر ہے۔''

اس نے شاہ جہاں کی بات کا جواب دینے کی بجائے کمبل سر تک اوڑھ لیا۔

اسی رات ڈاکٹر ابراہیم جب اس کے پاس آئے۔ کمرے میں بخاری جلتی تھی۔ سردی کا خفیف سا احساس بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر ابراہیم نے کرسی اس کے بیڈ کے قریب کھینچی۔ شاہ جہاں جاتے ہوئے انہیں اس کے آئندہ پروگرام کے متعلق بتا گئی تھی۔

''تم کچھ بتاؤ تو سہی۔''

اس نے نگائیں اٹھائیں۔انہیں دیکھا۔لمبی سانس بھری اور بولی۔

''ڈاکٹر صاحب! میں کل یا پرسوں تک چھوربٹ جانا چاہتی ہوں۔''

''لیکن کیوں؟'' ان کی آواز میں گھبراہٹ اسے محسوس ہوئی تھی۔

''سیلانی جو ہوئی۔نیلو کو جی بھر کر دیکھ چکی ہوں۔''

اس نے ان کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔آنکھیں اٹھا کر سرسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی دہاں۔کیونکہ اس وقت وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

بھلا سوچئے تو میں آپ کو یہ کیسے بتاؤں کہ میں گھر سے مفرور ہوں۔ایک لاوارث بنجر زمین ہوں۔آپ جیسا کوئی مہربان میری کہانی سن کر اپنی آنکھوں میں میرے لئے رحم بھر کر مجھے دیکھے تو میرا کلیجہ نہ کٹ جائے گا۔میں اپنے دکھوں کا سارا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں کسی کو حصہ دار بنانا مجھے قطعی پسند نہیں۔''

پھر اس نے اٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے، جھکی داہنے ہاتھ پر بوسہ دیا اور جذبات سے عاری آواز میں بولی۔

''ڈاکٹر صاحب، مجھے معاف کر دیجئے گا۔''

پھر وہ سیدھی کھڑی ہوئی اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی سنجیدگی تھی کہ ڈاکٹر ابراہیم کو حوصلہ نہیں ہوا کہ وہ مزید اصرار کریں یا اسے روکیں کہ جوان کے پاس کھڑی انہیں کہتی تھی۔

''چلئے آیئے ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر سیف اللہ کے گھر چلتے ہیں۔میں دادی جواری کے گھر کا پتہ سمجھ آؤں۔؟''

سیف اللہ اور اس کی بیوی نے ہر چند کہا کہ وہ رک جائے۔پر وہ اڑیل ٹٹو کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔سیف اللہ بولا۔

''بھابھی سیماں ہمیں بہت برا کہے گی کہ ہم نے آپ کو آگے دھکیل دیا۔''

''لو یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے کوئی میری مرضی کے خلاف دھکا لگا سکتا ہے۔ ارے نہیں سیف اللہ مت گھبراؤ میں آج رات اس سے بات کروں گی۔''

شاہ جہاں سے اجازت لینا اس کے لئے بہت دشوار مرحلہ ثابت ہوا۔ وہ کسی طور اس کی جان بخشی کے لئے تیار نہیں تھی۔ زچ ہو کر اس نے اس کے دونوں گال باری باری چومے اور بولی۔

''یہ کیا مصیبت ہے کوئی میں تمہاری زرخرید لونڈی ہوں جو یوں مجھے اپنے لئے محفوظ کرنا چاہتی ہو۔ جانے دو گی تو پھر بھی آؤں گی۔ ورنہ رسی تڑوا کر ایسی بھاگوں گی کہ پلٹنے کا نام نہ لوں گی۔



اس کے تو سان وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ جب چھوربٹ کے لئے ستر ونپی بازار آئے گی وہاں ڈاکٹر ابراہیم اسے الوداع کہنے کو موجود ہوں گے۔ اسپتال میں کل جانے کی اس نے ضرورت لگائی تھی۔ لیکن شاہ جہاں کے گھر آ کر اسے آمادہ کرنے میں ہی دو دن گزر گئے۔ اپنے اگلے پروگرام کے متعلق اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی تھی بس جیپ کا چھوکرا شاہ جہاں کے نوکر کے ساتھ محل آیا تھا یہیں اس سے پیسے طے ہوئے تھے بلکہ شاہ جہاں نے اس کے منع کرنے پر بھی رقم خود ادا کی تھی۔

ڈرائیور نے جیپ چلو بالا میں لانے کو کہا لیکن وہ بولی ''نہیں رہنے دو، میں وہیں نیچے آجاؤں گی۔''

اور جب اس نے بیگ جیپ میں پھینکا۔ سامنے ڈاکٹر ابراہیم کھڑے تھے۔ پہلی بار وہ ساری جان سے لرز گئی تھی۔

اب وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ گندمی چہرے پر دو چمکدار آنکھیں جن میں نرمی اور شفقت گھلی ہوئی تھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ اس کے قریب آئے، اور بولے۔

''معاف کرنا شاید تم نے سمجھا ہو کہ میں نے تمہارے وجود کے ساتھ کوئی توقع وابستہ کی ہے۔ دراصل کہف الوریٰ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ بلا سے ان کی دائمی قربت نصیب ہو یا نہ۔''

اس نے یہ سب سنا۔ اپنے سامنے دیکھا۔ دائیں بائیں چند دکانیں ان پر سایہ فگن چند ٹنڈ منڈ درخت، پرے جھانکتا نیلا آسمان، اِکا دُکا راہگیر اور دکانوں پر کھڑے خال خال گاہگ۔

اس نے جیپ کا دروازہ کھولا۔ سیٹ پر بیٹھ کر اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا کر دھیرے سے بولی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کے متعلق بھی کوئی دوسرا آدمی یہی سوچ رکھ سکتا ہے۔

پھر ان کا بالوں سے بُر گندمی ہاتھ اس کے ہاتھ پر آیا۔ اور انہوں نے کہا۔

''خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

جیپ سٹارٹ ہوگئی۔ انہوں نے ڈرائیور لڑکے سے کہا'' احتیاط سے گاڑی چلانا۔''

ان کا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ اس نے قصداً رخ پھیر کر پیچھے نہیں دیکھا۔ حالانکہ اس کے کانوں میں خدا حافظ فی امان اللہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔

جیپ دریائے شیوق کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔ اس کا دل یوں لگتا تھا جیسے منوں وزنی پتھر کے نیچے آیا ہوا ہو۔ ساری فضا غم و درد میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

دفعتاً اس نے لڑکے سے کہا ''میں تھگسں میں میر عارف کا آستانہ دیکھنا چاہتی ہوں تم مجھے پار لے چلو۔''

اور وہ بولا ''چلو سے سرمو کا پل تقریباً پندرہ کلومیٹر ہے۔ وہاں سے ''غورسے'' کا گاؤں اس سے بھی زیادہ دور ہے اور تھگسں اس سے بھی آگے ہے۔ واپسی کا سفر بھی اتنا ہی ہوا۔ آپ بتائیے چھوربٹ کب پہنچیں گے؟''

اس نے کہا'' یہ تو تم بہتر جانتے ہو کہ کب پہنچیں گے۔ رات بھی ہوگئی تو خیر صلا۔ مجھے کون سی وہاں حاضری دینی ہے۔ رہا یہ سفر تو میں تمہیں اس کے پیسے دوں گی۔''

اور لڑکا خوش ہوگیا۔ سرموں کا گاؤں آیا۔ کوئی دس کلومیٹر پر سرمو پل سے جیپ مڑی یہ سرموں اور رغور سے کے گاؤں کے درمیان رابطہ پل ہے۔ پل پار کیا اور ساتھ ہی ریت کا

میدان شروع ہو گیا۔غور سے تک پہنچتے پہنچتے اچھا بھلا سرمنہ ریت اور مٹی سے اٹ گیا۔تھلکس میں جیپ جب اس پرانی مسجد کے پاس سے گزری جسے ۱۰۱۲ھ ۱۶۰۳ء میں سید علی وسید ناصر طوسی نے تعمیر کیا تھا۔تو وہ اتری اور اس نے دعا مانگی۔

جب وہ میر عارف کے آستانے پر پہنچی اس وقت گیارہ بج رہے تھے اور بھوک زوروں پر تھی۔اس نے سوچا پہلے وہ نفل وغیرہ پڑھ لے پھر کھانے پینے کا سلسلہ شروع کرے۔

ہلکے چاکلیٹی پہاڑ آستانے کے پس منظر میں خاموش پاسبانوں کی طرح کھڑے تھے۔ آستانے کی نچلی جالیوں کے پاس دو عورتیں بیٹھی گریہ زاری میں مصروف تھیں۔پتہ نہیں کیسے دکھ کی آگ ان کے اندر جل رہی تھی۔

ساتھ میر اسحاق کا آستانہ بھی تھا۔میر اسحاق کے آستانے کی برجی اور میر عارف کے آستانے کا نچلا حصہ ایرانی وکشمیری فن نقش کاری کا نادر نمونہ تھے۔منتوں اور مرادوں کے رومال ہوا سے پھڑ پھڑاتے تھے۔وہ اندر گئی۔دیوار کے ساتھ ٹک کر جب وہ فرش پر بیٹھی اس کے دل کی بے کلی آنسوؤں کی صورت میں ظاہر ہونے لگی۔وہ روتی رہی جب وہ رو رو کر ہلکی ہوئی تب اٹھی دو نفل پڑھے اور باہر آئی۔خانقاہ دیکھی پتھروں پر بیٹھ کر اک ذرا دھوپ سے جسم کو گرم کیا۔جیب سے خشک خوبانیاں نکال کر کھائیں اور پھر جیپ میں بیٹھی۔

''آپ یہاں تک آ گئی ہیں۔تو اب خانقاہ معلّی سینو بھی دیکھتے چلئے۔ڈرائیور لڑکا بولا۔

''تم دکھانا چاہتے ہو اور میں دیکھنا چاہتی ہوں۔بھلا اس سے زیادہ مفاہمت اور کیا ہوگی۔''

''تھلکس اور سینو کا درمیانی فاصلہ چھ سات کلو میٹر سے زیادہ نہیں۔''

سینو کی خانقاہ معلّی نہایت خوب صورت،بہترین حالت میں اور بہت بڑی خانقاہ تھی اندر جانے کے لئے وہ شعر موزوں بیٹھتا تھا کہ

انہی پتھروں پہ چل کر اگر ہو سکے تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

سارے میں پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ راستے کے عین درمیان میں چوبی پائپ اوپر تک گیا ہوا تھا۔ اگلا حصہ بری طرح پتھروں سے اٹا پڑا تھا۔ وہ داہنی سمت احتیاط سے پاؤں رکھتی ہوئی آگے بڑھی۔

سامنے والا برآمدہ بارہ چوبی ستونوں میں منقسم تھا۔ درمیان میں دوستونوں کے ساتھ نفیس چوب کاری کی چوکھٹ نصب تھی۔ بائیں سمت سرمئی پہاڑ نیم دراز معلوم ہوتے تھے۔ چھت پر سپیکر نصب تھا۔

خانقاہ کے بارے میں اس نے خپلو میں سنا تھا کہ یہاں ہر دعا قبول ہوتی ہے۔

جب وہ سورۃ فاتحہ پڑھ چکی، تب اس نے اپنے آپ سے کہا '' میں کیا مانگوں؟ اپنا گھر۔ اپنے لئے بچے، ڈاکٹر ابراہیم یا کچھ اور۔'' پھر عجیب سا ہوا۔ اس کا اندر بوٹیوں میں کٹنے لگا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا، کچھ نہیں مانگنا میں نے۔ پیدا کرنے والا ابھی کچھ جانتا ہے۔ وہ اگر کھلونا بنا کر کھیل رہا ہے تو میں اسے کھیل سے روکنے والی کون ہوں؟''

شاہ جہاں نے بیگ میں سیب خشک پھل اور پراٹھے ڈال دیئے تھے۔ وہ سب اس نے نکال لئے وہ اور ڈرائیور کھاتے رہے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ ڈرائیور بتا رہا تھا۔

'' سینو سے آگے سلترو گلیشیئر ہے اور سلترو سے اوپر شہرہ آفاق سیاچین گلیشیئر جس کے عین دامن میں چھوربٹ واقع ہے۔''

اب ایک بج رہا تھا اور ڈرائیور کا خیال تھا کہ اب انہیں چھوربٹ کے لئے چلنا چاہیے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔

'' ارے تو پہلے کیوں نہ بتایا ذرا جلدی کر لیتے۔''

تھکس اور سینو خپلو سے اوپر کی جگہیں ہیں۔ سرمو پل سے آنا پڑتا ہے۔ اس لئے بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

اب اس نے سر اور منہ اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ جیپ کے شیشے اچھی طرح

چڑھالئے تھے۔

نولکھا، ڈآ وُو،کواس اور سنگ کی وادیاں گزر گئیں۔ دریائے شیوق کے پار کے گاؤں عباوان پر توک اور مرچھا بھی اس نے ڈرائیور کے بتانے پر دیکھے۔ بید چنار، شاہ بلوط اور پھلوں کے درخت سب ننگے بچے تھے۔ وادیوں کی ساری دل کشی اور حسن ماند پڑا ہوا تھا۔

پھر پیون آیا۔ پیون چھور بٹ کی ایک اہم وادی جہاں آ رمی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ساری سیکٹر میں متعین فوج کے لئے رسل و رسائل کے انتظامات یہیں سے کئے جاتے ہیں پیون میں ہی نالہ چھور بٹ دریائے شیوق میں گرتا ہے۔ عصر کی نماز اس نے چھور بٹ نالہ کے پاس پڑھی۔ پرانے وقتوں میں اس نالے کے راستے کشمیر کے لئے آمدورفت ہوتی تھی۔

پیون سے آگے سکسہ تھا۔ اس کی منزل/سکسہ چھور بٹ کا صدر مقام ہے۔ سردیوں کی یہ شام بہت جلد ڈھل گئی تھی۔ جیپ والا نہایت مستعد ڈرائیور تھا۔ بہت تیزی سے گاڑی چلا کر لایا تھا۔

جیپ بازار میں سے گزری۔ دس پندرہ دکانیں بازار کی صورت میں دائیں بائیں واقع تھیں۔ پانچ چھ ذراہٹ کر ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ جامع مسجد کے پاس گاڑی رک گئی۔ یہ محلّہ یگ چھد تھا مسجد کے ساتھ والا گھر وادی جواری کا تھا۔ جن کے پاس رہنے کے لئے وہ آئی تھی۔

دومنزلہ گھر، پتھروں کی سیڑھیاں، اوپر کی منزل کے لئے نہیں نچلی منزل کے لئے اس نے دھیرے دھیرے پاؤں ان پر جمائے اور بڑے کمرے میں داخل ہوئی۔

یہاں کونے میں چولہا جلتا تھا۔ وادی جواری ہر دو گوڑ نیو (چنٹ والی شلوار) پر سیاہ فیتوں والا کرتا، سر پر فلو والی ٹوپی اور اس پر سیاہ چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ کمرے میں چھور بٹ کا خوشنما پپو (دری) بچھا ہوا تھا۔ کونے میں لالٹین جلتی تھی۔ دوسرے کونے میں آڑے رخ بندھی تار پر رضائیاں لٹکی تھیں۔ چولہے کے پاس دیوار میں پھنسے تختوں پر برتن دھرے تھے۔ ہنڈیا

پکتی تھی۔ کمرے میں گوشت کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ اور وہ چپ چاپ کھڑی اس سارے ماحول کو دیکھتی تھی، اور سوچتی تھی کہ دانہ پانی اسے کہاں کہاں اڑائے لئے پھرتا ہے۔

جب ساتھ والے کمرے سے ایک نوخیز لڑکی نکلی۔ اس نے حیرت سے چند لمحے اسے دیکھا۔ پھر دادی جواری سے کچھ بولی۔ دادی جواری نے اپنی نگاہوں کا رخ پھیر کر جب اُسے دیکھا تو وہ کھل اٹھیں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئیں پر قدم اٹھانے سے قبل ہی وہ ان کے پاس پہنچ گئی اور ان کے پھیلے بازوؤں میں سما گئی۔

اسی وقت چائے بنی میٹھی چائے جس کی سطح مکھن سے بھری ہوئی تھی۔ چینی دادی جواری نے کہہ کر ڈلوائی تھی۔ گھر کا کلچہ۔ وہ کلچہ کھاتی رہی۔ چائے پیتی رہی اور دادی جواری کی آنکھوں سے چھلکتے خوشی کے جذبات پڑھتی رہی۔

اس نے چائے کے دو پیالے پئے۔ ساتھ والے گھر کی ایک نوجوان لڑکی آئی۔ جس نے بلے خاپا (ایک پاؤ) مکھن ادھار مانگا۔

دادی جواری نے منجھلی بہو کو ستراٹگ (ترازو) لانے کو کہا۔ یہ عجیب قسم کا ترازو تھا۔ لکڑی کے ایک سرے پر لکڑی کا ہی ایک گولہ دوسرے سرے پر تین مضبوط ڈوریوں سے لٹکا ہوا، چمڑے کا پلڑا۔ ڈنڈے پر پیمانے لکیروں کی صورت کندہ تھے۔ پلڑے میں مکھن ڈال کر ان لکڑیوں میں ایک اور ڈور ڈال کر وزن کیا گیا۔

دادی جواری جموں میں بہت عرصہ رہی تھیں۔ اردو نہ صرف سمجھتی تھیں۔ بلکہ صاف ستھرا بول بھی لیتی تھیں۔

مکھن اس کی کٹوری میں رکھ کر ہنستے ہوئے بولیں۔

’’دیکھا تم نے ہمارا ترازو۔‘‘ اور اس نے جواباً ہنس کر کہا۔ ’’واقعی دادی کمال کی چیز ہے۔‘‘

گھر میں بڑی بہو، اس کے تین بچے منجھلی بہو اس کے چار بچے اور چھوٹی بہو اپنے دو

بچوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ بڑے کمرے کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ جن کے فرش پر نرم گھاس پر دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر گدے اور گدوں پر رضائیاں دھری تھیں۔

توے پر موٹی موٹی روٹیاں پک گئی تھیں۔ کھانا تیار تھا اور گھر کے ان دو مردوں کا اب انتظار ہو رہا تھا۔ جو دوپہر سے باہر تھے۔ تیسرا بیٹا کیپٹن کاظم ان دنوں سیاچن پر متعین تھا۔

اس نے چاہا کہ وہ غلام حیدر کے ہاں جائے۔ پر دادی جواری بولی۔

''اس وقت وہ نہیں ملے گا۔ آج کل چھور بٹ میں بہت بلّہ گلّہ ہو رہا ہے۔''

ابھی وہ یہ پوچھنے والی تھی کہ بلہ گلہ کس بات کا، کہ دونوں مرد گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے فوجی وردی میں کندھے پر تین ستارے سجائے ایک خوبصورت جوان بھی تھا۔ جس پر نظر پڑتے ہی جہاں دادی جواری خوشی سے چلائیں وہیں گھر کی چھوٹی بہو بھی گلاب کی طرح کھل اٹھی۔ دادی جواری کے گلے لگنے اور ان کے منہ ماتھا چومنے کے انداز نے اسے بتایا کہ وہ گھر کا چھوٹا بیٹا کیپٹن کاظم ہے۔ بڑی بھاوجوں سے ملنے اور بچوں کو پیار کرنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ دادی جواری نے بلتی میں اس کے متعلق بتایا۔ مسکرا کر اس نے سلام کیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں زور و شور سے باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر تک وہ ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھتی رہی۔ پھر جب ذرا سی خاموشی ہوئی تو اس نے پوچھا۔ دادی جواری نے بڑے بیٹے سے کہا کہ وہ اسے بتائے۔

دادی جواری کا بڑا بیٹا محمد جعفر اس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرایا اور بولا۔

''اردو تو میں بول لیتا ہوں۔ پر بہت اچھی بولنے سے مجبور ہوں۔ آپ نہیں سمجھیں گا نہیں۔''

ارے نہیں، یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ آپ بول لیتے ہیں۔ بعض لوگ تو لسانی تعصب میں اُلجھ کر اچھی بھلی زبان جانتے ہوئے بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔''

''ہماری دادی سکمہ سے اگلا گاؤں سیاری ہے۔ جسے سیاری سیکٹر کہتے ہیں۔ یہاں پاک

فوج متعین ہے۔اس کے عین اُوپر فوجی اور سیاسی اہمیت کا حامل سیاچن گلیشیر ہے۔ایک عام آدمی یقیناً اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ پاکستانی فوج کن حالات میں آٹھ ہزار آٹھ میٹر بلندی پر ننگی بیٹھی، برف کے سمندر میں وحشی دنیا کی انوکھی لڑائی لڑنے میں مصروف ہے۔

افواج پاکستان رسدو رسائل کی فراہمی اور بار برداری کے لئے مقامی انتظامیہ کے تعاون سے مختلف ٹھیکیداروں کی خدمات حاصل کرتی ہے مقامی انتظامیہ اپنے رشتہ داروں کو یہ ٹھیکے فراہم کرتی ہے اور یہ ٹھیکیدار پولیس کو ساتھ ملا کر عوام سے بیگار کے طور پر زبردستی بار برداری کا کام لیتے ہیں۔

ڈوگرہ دور میں بلتی قوم پر کیا کیا ستم ٹوٹتے تھے۔کس کس انداز میں ان پر فالج گرتا تھا ''بیگار سسٹم'' ان کے جسم میں سرطان کے پھوڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔پر تب بات غلامی پر ٹوٹتی تھی۔ذہن میں محکومی کا احساس تھا۔

پر اب ایسا کیوں ہو۔بے شمار گھروں کے چشم و چراغ بار برداری کے اسی چکر میں بلندیوں سے گرے اور ختم ہو گئے۔ان کے لواحقین کو ایک دھیلا بھی نہیں ملا۔اس ماہ کی تین تاریخ کو چھوربٹ کے لوگوں نے تنگ آ کر شمالی علاقوں کے مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کو اپنی تکالیف اور مسائل سے آگاہ کیا۔انہوں نے اعلان کیا کہ آئندہ اس علاقے کے عوام سے کسی قسم کا بیگار نہیں لیا جائے گا۔اور نہ ہی پولیس عوام کو ہراساں کرے گی۔ٹھیکیدار اپنے معاہدے کی رُو سے خود ہی بار برداری کا ذمہ دار ہوگا۔

لیکن اب انتظامیہ اور پولیس ٹھیکیداروں کی ملی بھگت سے علاقے کے معززین اور سرکردہ لوگوں کو جو غریب عوام کے لئے سینہ سپر ہیں جھوٹے اور بے بنیاد مقدمات میں ملوث کر کے گرفتار کر رہی ہے۔سارے علاقے میں شدید بے چینی اور اضطراب کی فضا پیدا ہو چکی ہے۔ان زیادتیوں سے تنگ آ کر کل یعنی ۲۲ نومبر کو بچے بوڑھے عورتیں اور مرد اپنے گھر مال مویشی چھوڑ کر اسلام آباد دادرسی کے لئے روانہ ہو گئے۔سیاری سیکٹر میں جب یہ لوگ تیس کلومیٹر کا

فاصلہ طے کر چکے تو مقامی فوجی حکام کی کوششوں اور علاقے کے معززین کی مدد سے اس شرط پر گھروں میں واپس لوٹنے پر آمادہ ہوئے۔ کہ ان کے دکھوں کی دادرسی کی جائیگی۔ کاظم اسی سلسلے میں فوجی افسروں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔

آخران ٹھیکیداروں اور بڑے لوگوں کے پیٹ زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ انہیں روٹی کی زیادہ ضرورت ہے۔ ان کے مسائل ایک عام آدمی سے زیادہ ہیں۔"

اور اب دادی جواری کا دوسرا بیٹا بولا تھا۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق سرحدی علاقوں کے عوام کو حکومت سے متنفر کرانے کی سازش کی جاری ہے۔"

وہ گم سم بیٹھی اس صورت حال کی تصویر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور سوچتی تھی کہ جبر اور استحصال کے یہ سلسلے کب تک جاری رہیں گے۔ اپنے آپ میں گم اور خود سے باتیں کرتے کرتے وہ اس وقت چونکی جب کاظم وردی بدل کر شلوار قمیص میں ملبوس گود میں چھوٹا بچہ اٹھائے اس کے پاس آ کر بیٹھا۔ اس نے شستہ اُردو میں اس کے بلتستان آنے اور یہاں مقامی لوگوں کے ساتھ رہنے کے جذبے کو سراہا۔

کاظم کے سرخ و سفید چہرے پر اس نے ایک سرسری سی نظر ڈالی اور کہا۔

"میں" وہ رکی اور پھر دوبارہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میں کیا ملک کے نوے (۹۰) فیصد لوگ سیاچن کے محاذ پر ہونے والی لڑائی اور دیگر واقعات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیا آپ مجھے اس سلسلہ میں کچھ بتانا پسند کریں گے۔" کاظم ہنسا" آپ نے نوے فیصد کہہ کر حسن ظن سے کام لیا۔ یہ کہیے کہ ننانوے فیصد لوگ لاعلم ہیں۔"

اب کے اس کے مسکرانے کی باری تھی۔ وہ خفیف سا مسکرائی۔

"میں مانتی ہوں"

کیپٹن کاظم نے قالین پر رکھے اس چائے کے پیالے کو اٹھایا جسے اس کی نازک سی نو عمر بیوی بڑی چاہت سے چھوٹی سی ٹرے میں اس کے سامنے سجا گئی تھی۔اس نے نمکین تیرتی نمکین چائے کا گھونٹ بھرا اور دفعتاً چونک کر بلتی میں اونچے سے بیوی سے کچھ بولا۔

بیوی نے بھی جواباً کچھ کہا تھا۔کیپٹن کاظم نے پھر اس کی طرف دیکھا اور لفظ چائے کہا۔

''آپ پیئیں میں پی بیٹھی ہوں۔'' وہ اس کا مدعا سمجھ کر فوراً بولی۔

ہماری بلتی زبان میں ''سیا'' جنگلی گلاب کو کہتے ہیں۔سفید پیلے اور گلابی رنگ پھولوں والا یہ سخت جان پودا ہی یہاں اگتا ہے ''چن'' کا مطلب والا سے ہے۔یعنی جنگلی گلابوں والا ۷۵ کلومیٹر لمبا ۵ سے ۷ کلومیٹر چوڑا اور تقریباً ۲۱۰۰۰ ہزار سے ۲۴۰۰۰ ہزار تک بلند قطبین سے باہر یہ دنیا کا سب سے بڑا گلیشیئر ہے۔مختلف اوقات میں مختلف غیر ملکی کوہ پیماؤں اور سیاحوں کی ٹیموں نے حکومت پاکستان کی اجازت سے اس کی بعض چوٹیاں اور دروں کو سر کرنے کی کوشش کی تھی۔

کیپٹن کاظم نے چائے کا خالی پیالہ ٹرے میں رکھتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر قبضے کے بعد ہندوستان کا دماغ خراب ہو گیا تھا وہ اپنے آپ کو جنوبی ایشیا کی زبردست طاقت بنانا اور منوانا چاہتا تھا۔نیفا میں چینیوں کے ہاتھوں شکست کا زخم بھی اس کے سینے پر تھا۔اسی لئے ۱۹۸۴ء میں اس نے سیالا اور بلافون دو اہم پاکستانی دروں پر قبضہ کر لیا۔اس کا ارادہ بیک وقت چین اور پاکستان کو سبق سکھانے کا تھا۔نتیجتاً سمندر میں ایک نرالی اور عجیب وغریب لڑائی کا آغاز ہو گیا۔جو جانے کب تک جاری رہے گی۔

پاکستان آرمی کے لئے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔شدید سردی آکسیجن کی کمی زیادہ بلندی پر پیدا ہونے والے عارضے جن میں فراسٹ بائٹ (Frost Bite) سرفہرست ہے۔راشن ایمونیشن مٹی کے تیل اگلوز اور جدید ہیلی کاپٹروں کی فراہمی ایسے مسائل فوری حل طلب تھے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتی ہیں کہ جہاں اس وقت آپ بیٹھی ہیں۔کیپٹن کاظم نے گفتگو کا

سلسلہ توڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

اس کے عین اوپر گرمیوں کے اس موسم میں بھی درجہ حرارت منفی ۱۰ سے ۱۵ اسنٹی گریڈ رہتا ہے۔ برف کے اس خوفناک سمندر میں چلتے ہوئے آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ گہری برفانی کھائیاں اور اندھے کنوئیں بھی آپ کے منتظر ہیں۔ اچھے بھلے موسم میں ایکا ایکی خوفناک برفانی ہوائیں اور زبردست برفباری اگلو میں بیٹھے ہوئے بھی آپ کا خاتمہ کر سکتی ہیں۔ آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا پہاڑوں کی چوٹیوں سے سلائیڈز گر کر پل بھر میں آپ کو دوسری دنیا میں پہنچا دیتی ہیں۔ آپ نہیں جانتے کب اور کس وقت آپ اچانک فراسٹ بائٹ کا شکار ہو جائیں گے۔

یہ سب تکلیفیں یہ سارے عذاب اور یہ ساری صعوبتیں ہمارے جوانوں اور افسروں کے سامنے ہیچ ہیں۔ میں آپ کو قائد او۔ پی کے معرکے کی تفصیل سناؤں کہ نائب صوبیدار عطا محمد نے کس جوانمردی سے دشمن کے تین بڑے حملوں کو پسپا کیا اور شہید ہوا۔ ۱۰۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی پر بلافون سیکٹر میں معرکہ حق و باطل کیسے ہوا؟ کیپٹن محمد اقبال اور کیپٹن سالک چیمہ نے ثابت کیا کہ مومن کیسے ہوتے ہیں اور ان کے فولادی عزم کے سامنے پہاڑ روئی بن کر کیسے اڑتے ہیں۔ معرکہ چھونک کا ذکر کروں کہ کیپٹن محمد جاوید اور کیپٹن غلام جیلانی نے ناممکن کو کیسے ممکن بناتے ہوئے شہادت کا جام نوش کیا۔

۲۲۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی پر سلنگ سے اُتارے جانے والے جوانوں کا ذکر کروں اور یہ بھی بتاؤں کہ پہلی بار جب ہیلی کاپٹر سے لیفٹیننٹ نوید اور نائیک یعقوب کو ان کے زبردست اصرار پر سلنگ سے اتارا گیا تو انہوں نے ۷۲ گھنٹے وہاں کیسے گزارے کیپٹن کامران اور میجر بلال نے گنگا بیس کو کیسے تباہ کیا۔

چند ایک نہیں سینکڑوں ایسے کارنامے ہیں جن پر پوری قوم ناز کر سکتی ہے سچی بات ہے مجھے وہ شعر بڑا حسب حال لگتا ہے ۔ کہ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں

کیپٹن کاظم ہنسا۔ ہنسنے سے اس کے موتیوں جیسے دانت نمایاں ہوئے تھے۔

ایک پہلو اور بھی تخریب میں تعمیر کا۔ سیاچن کی لڑائی نے ہمارے بلتستان کے وہ پس ماندہ علاقے بھی ترقی یافتہ کر دیئے ہیں جن کے آئندہ پچاس سالوں میں آگے بڑھنے کے امکانات زیرو فی صد تھے۔ ہمارے انجینئر پہاڑوں اور گلیشیئروں کو کاٹ کاٹ کر سڑکوں کا جال بچھا رہے ہیں بجلی کی فراہمی کو ممکن بنا رہے ہیں۔ لوگوں کو روزگار مل رہا ہے اور ان کی معاشی حالت بدل رہی ہے۔ رہے یہ احتجاج اور مارچ تو یہ بیداری کی علامت ہیں اپنے حق کے لئے آواز نکالنا اور قدم اٹھانا دونوں زندہ قوم کی علامت ہیں۔



دادی جواری کے گھر کے ساتھ ہی وہ دونوں رہتے تھے۔ غلام حیدر اور ان کی بیوی سکینہ اسے سکینہ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اشتیاق کے اس پس منظر میں ایک بہت اہم سوال بھی تھا۔ جو اس وقت سے اُس کے ذہن میں ہل چل مچائے ہوئے تھا۔ جب اس نے یہ جانا تھا کہ سکینہ کے ہاں کوئی بچہ نہیں، وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ ماں نہ بن سکنے کے کرب کو کس قدر محسوس کرتی ہے اور یہ کہ اس کے شوہر کا ردِ عمل کیسا ہے؟ اس نے کبھی طعن و تشنیع سے کام لیا؟

سکینہ بی بی نے ہنستے ہوئے کہا تھا "بیٹی میں کیوں زندگی کو روگ بناتی۔ بچہ تو نصیبوں کی بات ہے۔ اوپر والے نے نہیں دیا نہ سہی۔ اس کی مرضی۔ رہا حیدر خان، وہ تو میرے دم کے ساتھ دم بھرتا ہے۔ میں نے تو اسے کہا تھا دوسرا بیاہ کرلو۔ پر اسے تو میرے ساتھ عشق ہے۔"

وہ اس جوڑے کے ساتھ اتنی گھل مل گئی تھی کہ اب اس کا زیادہ وقت ان لوگوں کے ساتھ ہی گزرتا وہ دونوں بھی اس کے ساتھ بہت خوش رہتے تھے۔

اس وقت کہنے کو دوپہر تھی۔ پر موسم سرما میں سکسہ سورج کی زد سے کچھ باہر رہتا تھا۔ غلام حیدر اس وقت اس گھاس سے جسے کرسمہ کہتے ہیں۔ برف باری میں پہننے کے لئے اپنے اور سکینہ کے لئے جوتے بنا رہا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھی اس کے ہاتھوں کی تیز جنبش دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"میرے لئے بھی ایک ایسا ہی پولا (کرسمہ سے بنے ہوئے جوتے کا نام) بنا دونا۔ برف باری تو ہونے والی ہے۔ میں کیا پہنوں گی۔"

غلام حیدر رک گیا۔اس کی طرف دیکھ کر ہنسا اور بولا۔

''بہت بے صبری ہے تو''''اوسکینہ''اس نے زوردار آواز لگائی۔

سکینہ ہنستے ہوئے کمرے سے بلم کا جوڑا نکال لائی۔ پٹو اور چمڑے سے بنے ہوئے اس جوتے پر سکینہ نے خود کشیدہ کاری کی تھی۔بلم کا ایک جوڑا اس سے پہلے وہ پہن چکی تھی۔

روح اللہ نے چھوربٹ سے اس کے لیے منگوایا تھا۔وہ اتنا نفیس تھا۔وہ پھڑک اٹھی تھی۔

اب سکینہ پھر کوٹھری میں گئی اور اس کے ناپ کا پولا لے آئی۔

''یہ میں نے تیرے لئے خود بنائے ہیں۔''

اس نے غلام حیدر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔انہیں اپنے ہونٹوں سے لگایا اور بولی۔

''میں شکر گزار ہوں۔''

سکینہ نے پیار بھری چپت اس کے سر پر لگائی اور بولی۔

''میرا کوئی نام نہیں،جس کے دیدے کڑھائی کرتے کرتے دکھنے لگے ہیں۔''

اس نے اٹھ کر دھان پان سی سکینہ کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔

''دیکھ تو وقت کیا ہو رہا ہے سکینہ!تو کچھ کھانے کو بھی دے گی یا یونہی فاقوں مارے گی۔''

''لو دیکھو!یہ ذرا سے فاقے سے مرنے لگا ہے۔ارے اتنا تو کہا تھا صبح کہ خالی چاء مت پیو،کلیجہ لے لو۔پر تیرا تو پیٹ ٹھیک نہیں تھا۔اب یہ بیٹی ہی روٹی کھلائے گی۔میں تو کپڑے دھونے جا رہی ہوں۔''

اور جب سکینہ اٹھنے لگی کہف الوریٰ نے اسے بٹھا لیا یہ کہتے ہوئے کہ میں روٹی بناتی ہوں۔تم کھا کر آرام کرو۔کپڑے کو بل سے میں خود دھلواؤں گی۔

اور وہ اس کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی''میری بچی عادتیں تو خراب نہ کر ہماری۔''

اس نے رگیم (لکڑی کا بنا ہوا لمبا سا بکس جس میں سردیوں کے لئے آٹا محفوظ کر لیا جاتا ہے) سے پرات میں آٹا نکالا، گوندھا، روٹی بنائی۔ پیاز اور مرچ کی چٹنی پیسی۔ ان کے گھر اعلیٰ نسل کی یاک گائیں تھیں۔ مئی کے پہلے ہفتے سے ستمبر کے آخر تک تینوں گائیں اور تیس بھیڑیں چھور بٹ نالہ میں رہی تھیں۔ حیدر خان نے اپنی باری کے دنوں میں بہت دھیان اور توجہ سے دودھ اکٹھا کیا تھا۔

سارے بلتستان میں رواج ہے کہ گرمیوں میں پہاڑوں پر چھوٹی چھوٹی وادیاں جو سبز ہو جاتی ہیں۔ مویشیوں کو ادھر منتقل کر کے ہر گھر کا ذمہ دار فرد ان کی دیکھ بھال اپنی اپنی باری پر کرتا ہے۔ اور ان کا دودھ خود لیتا ہے۔ یہ رسم بجون کہلاتی ہے۔

سکینہ نے مکھن اور گھی کے دو بڑے برتن بھر لیے تھے۔ اب ساری سردیاں انہیں گھی مکھن کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

اس نے گرم روٹیوں پر مکھن لگایا۔ اوپر چٹنی رکھی اور ان کے پاس لے آئی۔ غلام حیدر بولا۔

''تمہارے آنے اور ہمارے ساتھ رہنے سے مجھے احساس ہوا ہے کہ خدا نے ہمیں بچے نہ دے کر اچھا نہیں کیا۔''

''میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ دل بُرا مت کریں۔'' وہ ہنسا اور بولا۔ ''ایک دن تم چلی جاؤ گی۔''

کھانا کھاتے دفعتاً اس نے سر اٹھایا۔ سکینہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کیوں سکینہ آج ہم اس لڑکی کو اپو کھر اور کھیے کھر نہ دکھانے چلیں۔''

کہف الوریٰ نے کھانا ادھورا چھوڑا کر اپنے دونوں ہاتھ ان کی عین ناک کے سامنے جوڑ دیئے۔

''معاف کریں۔ وہاں اونچے عمودی پہاڑوں کی چوٹیوں پر ٹوٹے پھوٹے قلعے

ہوں گے بہت دکھ چکی ہوں انہیں۔''

''اچھا چلو تمہیں ڈونگ ڈونگ دکھاتے ہیں۔''

اور وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

''میں نے کہا نا میں ان شکستہ اور ویران قلعوں سے عاجز آ گئی ہوں۔''

''لو ارے بٹی! یہ تو چھوار نالے کی ایک تنگ پہاڑی گزرگاہ ہے جو کم و بیش ایک ہزار فٹ گہرے قدرتی شگاف میں سے گزرتی ہے۔ انتہائی خوب صورت اور قابل دید شے ہے دیکھو گی تو مبہوت ہو کر رہ جاؤ گی۔ بے اختیار زبان اس ربِ جلیل کی ثناء کا ورد شروع کر دے گی۔''

''اصولاً زبان کو تو یہاں ہر قدم پر ثناء کا ورد کرنا چاہیے۔ اب اگر یہ نہ کرے، تو اس کی سرکشی ہے۔''

اس نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

''پھر تمہیں سکساری ژھر (پہاڑی باغ) میں واقع تالاب دکھانے لے چلتے ہیں۔''

وہاں فطرت کے ایسے حسین مناظر ہیں کہ تم اٹھنے کا نام نہیں لو گی۔ میں تمہارے شانے پکڑ پکڑ کر ہلاؤں گا اور تم کہو گی۔ ابھی ٹھہرو تی تی آ تا۔ میری نظریں پیاسی ہیں۔''

اسی وقت وادی جواری کا بڑا بیٹا محمد جعفر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ فرانو کی یونین کونسل کا چیئرمین محمد صادق فرانو کے چند سرکردہ لوگوں کے ساتھ آیا ہے۔

غلام حیدر اٹھتے ہوئے بولا'' سکینہ تم لوگ رات کے کھانے کا بندوبست کرو۔ یہ لوگ اسی سلسلے میں آئے ہیں'' محمد جعفر جاتے جاتے اسے بتاتا گیا۔ ان کا خیال ہے کہ صدر مملکت سے اپیل کی جائے کہ وہ ٹھیکیداروں، پولیس اور انتظامیہ کے خلاف ایکشن لیں۔''

اس نے زیرِ لب دعا کی کہ اے خدا! ظالم اپنے انجام کو پہنچے۔

اس نے چاہا کہ اب وہ کپڑوں کی پوٹلی کول پر لے جائے اور انہیں دھلوائے۔ پر سکینہ مانی نہیں۔ اس نے کہا'' لو اب تھوڑا سا میرا ہاتھ بٹا دو۔ مغرب سے پہلے کھانا تیار ہوتا چاہیے۔''

اس نے پانی گرم کیا کر مبو (سنگ خارا سے بنی ہوئی ہانڈی) کو جلدی جلدی دھویا اوپر کی منزل پر جا کر لوہے کی سلاخ سے لٹکتے بکرے کی ایک ران کو کاٹا سکینہ کے ساتھ مل کر اس کی بوٹیاں بنائیں اور ہنڈیا چڑھادی۔

اور چراغ جلے وہ سب اندر آئے۔ سات مرد، او نچے صحت مند۔

سکینہ نے بڑی سینی میں گوشت کی بوٹیاں بمعہ شوربے کے ڈالیں اس نے روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ان میں بھگوئے کھانے کے بعد چائے چلی۔

اور پھر غلام حیدر نے اسے بلایا۔ سب کے ساتھ اس کا تعارف ہوا۔

محمد صادق صاف اُردُو بولتا تھا۔ اس کے سوال پر کہ یہاں رہنا کیسا لگ رہا ہے؟ اس نے کہا تھا۔

''میری زندگی کا یہ ایک بہت خوشگوار تجربہ ہے۔ میں اپنے ملک کے ان گوشہ ہائے دور دراز، دشوار خطوں کے نہ صرف مسائل سے آگاہ ہو رہی ہوں بلکہ محبتوں کی یافت میں بھی کامیاب ہوئی ہوں سچی بات ہے کہ قلب انسانی کے ان لطیف جذبات سے آشنا ہوئی ہوں جن پر ابھی مادیت نے سائے نہیں ڈالے۔''

ان کے سونے کا انتظام دادی جواری کے ہاں تھا۔ جب وہ لوگ چلے گئے۔ تب اس نے اور سکینہ نے کھانا کھایا اور جب وہ سونے کے لئے لیٹی اس نے کہا۔

''میں سوچتی تھی آج میں زرد ونگ خلو کیسر کی کہانی کا دوسرا باب سنوں گی۔ پر تی تی آتا بہت مصروف ہے۔ چلو پھر کبھی سہی۔''

اور اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔



جس کول کے کنارے بیٹھی وہ گرم پانی سے اپنے، سکینہ اور غلام حیدر کے کپڑے دھوتی تھی اس کا پانی ریشر RACER سے آتا تھا۔ جہاں وہ چشمہ ہے جس کا پانی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہے۔ سکینہ نے بہتیرا زور مارا کہ وہ کپڑے خود دھوئے گی پر اس نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ پیٹی بغل میں داب، ڈنڈا اور صابن ہاتھ میں پکڑ، اس کی گرفت سے نکل، یہ جا وہ جا۔

کپڑے اس نے پتھروں پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیئے۔ خود ان کے پاس ہی دھوپ میں بیٹھ گئی۔ اس شدید سردی کی وہ کب عادی تھی۔ دن بھر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا جسم سکڑ رہا ہے۔ رات کو دبیز لحاف اور کمرے میں جلتی آگ اس کی کپکپی کو کچھ کم کرتی۔ ہر کام وہ بھاگ بھاگ کر خود کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایک تو ان کا بڑھاپا تھا۔ دوسرے اسے دونوں سے بہت پیار ہو گیا تھا۔ انہیں کھانا دیتے ہوئے یا چائے کے پیالے پکڑاتے ہوئے وہ عجیب سی سرشاری میں ڈوبی رہتی۔

اُس نے چادر سر سے اتار کر اپنے سامنے رکھ لی۔ اور سارے جسم کو دھوپ میں پگھلنے کے لئے ڈھیلا چھوڑ دیا۔

سورج، پہاڑوں اور ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا
''کبھی سوچا بھی نہیں تھا قسمت کس کس در واز ے پر لے آئے گی۔''

شادی سے قبل اس نے زبیر کو نہیں دیکھا تھا۔ جب دیکھا تو بہت پسند آیا۔ بہت وجیہ

جوان تھا۔ پر اس وجیہہ جوان نے اُسے گھائل کر دینے والے زخم دیئے تھے۔ زبیر کے متعلق سوچتے سوچتے وہ بہت دور نکل آئی تھی۔ اس کا دل بہت بوجھل ہو گیا تھا ساری کائنات اسے ویران نظر آنے لگی تھی۔

اسی وقت سکینہ اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی وہ کہتی تھی۔

''میں بھیڑ بکریاں، گھوڑے اور گائیں لے کر قلان جا رہی ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔''

قلان چھوربٹ کے صدر مقام سکسہ کی موسم سرما کی چراگاہ ہے۔ قلان پر سورج کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں۔ برف باری بہت کم ہوتی ہے۔ سکسہ کے لوگ اپنے مال مویشی قلان ہی لے جاتے ہیں۔

''کمال ہے اب جب آدھا دن گزر گیا ہے آپ کو قلان جانا یاد آیا ہے۔ صبح کوئی ذکر نہیں کیا۔''

''ارے بیٹی ڈھور ڈنگر کئی دنوں سے ایک طرح اندر بند ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ کچھ ان کی ٹانگیں کھلیں۔''

''کل صبح چلیں گے۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

دونوں نے کپڑے اکٹھے کئے گٹھڑی بنائی اور گھر آ گئیں۔

شام ابھی پوری طرح ان کے آنگن میں نہیں اُتری تھی۔ جب دادی جواری کی چھوٹی بہو ان کے گھر آئی اور اس نے پیغام دیا کہ آج شب گھر میں آس پڑوس اور میل ملاقات والوں کا اکٹھ ہے۔ مولوی عبدالمنان ''کواس'' سے آئے ہیں۔ جو حملہ حیدری بیان کریں گے۔''

''کوئی کہانی گیت وغیرہ نہیں ہوگا۔'' اس نے زینب کے پاس آ کر مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

اور زینب نے بظاہر غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیا۔ تم نے تو یہاں ڈیرے ڈال لئے ہیں ابھی رات کا پہلا پہر ہوتا ہے۔

پوچھنے آؤ کہ کہف الوری کہاں ہے؟ سکینہ آ موز ور سے آ واز لگاتی ہے۔ ارے زینب بچی سوگئی ہے تھکی ہوئی تھی نا، بیل گھوڑے جوتتی ہو سارا دن۔''

اور اس نے ہنستے ہوئے اس کی گردن میں باز وڈال دیئے۔

''اب تمہیں بتاؤ میں کیا کروں گی وہاں آ کر۔ سارا بیان بلتی زبان میں ہوگا۔ میرے پلے تو ایک لفظ نہیں پڑے گا۔ ہونقوں کی طرح بیٹھی تمہاری صورتیں تکتے جاؤں گی۔''

''تو تم اب بلتی سیکھو نا۔ میں تمہیں سکھاتی ہوں۔''

''چلو یہ تو بات ہوئی نا۔''

وہ تاکید کرتے ہوئے چلی گئی کہ آ نا ضرور، بھولنا نہیں۔

سکینہ کے کہنے پر اس نے مغرب سے ذرا پہلے سارا کام نپٹا لیا۔ دال پکائی۔ بستر بچھائے لالٹین میں تیل ختم تھا۔ اس میں تیل ڈالا۔ اُسے جلا کر کیل سے لٹکایا۔ غلام حیدر کو کھانا دیا۔ خود کھایا اور سکینہ کو بھی دیا۔

دونوں جب دادی جواری کے ہاں گئیں تو انہوں نے اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

''تو نے تین دنوں سے اپنی صورت نہیں دکھائی مجھے۔ سکینہ نے تجھ پر جادو کر دیا ہے۔''

''ارے نہیں دادی۔ مجھ پر سکینہ نے کیا آپ سب نے جادو کر رکھا ہے۔''

بڑے کمرے میں بخاری چلتی تھی۔ دادی جواری خود رو رنگ کی قار (لوئی) اوڑھے بیٹھی تھیں۔ آنے والے مرد عورتیں دو سلام کرتے۔ ایک میر محفل کے لئے اور دوسرا کمرے میں موجود حاضرین کے لئے۔

دادی کی دونوں بڑی بہو میں خشک خوبانیاں اور تھوڑی تھوڑی زرشک سب لوگوں میں بانٹتی تھیں آج کمرے میں لالٹین کی بجائے گیس کا لیمپ جلتا تھا۔ اس کی دودھیا روشنی میں سفید چہروں والے مرد عورتیں اور سفید نظر آتے تھے۔

اس کے دائیں ہاتھ بیٹھی تین عورتیں بہت زور و شور سے باتیں کرتی تھیں۔ بلتی میں

ہونے والی یہ گفتگو اس کی سمجھ سے بالا تھی۔ لیکن چہروں کے تاثرات اور بقیہ لوگوں کی توجہ کا ان کی جانب مبذول ہونا اُسے اُکسا رہا تھا کہ وہ جانے معاملہ کیا ہے؟

اور معاملہ یہ تھا کہ ان میں سے ایک کے گھر پندرہ دن پہلے گھر والی کی بہن ڈاؤ سے آئی۔ وہ غالباً آسیب زدگی کا شکار تھی۔ وہ اسے لے کر بان (نجومیوں کی ایک قسم) کے پاس گئی۔ پتہ نہیں اس نے کیا کیا کہ وہ بے چاری موقعے پر وم توڑ گئی۔

اسی وقت مولوی عبدالمنان تشریف لے آئے۔ موٹے تازے سرخ و سفید مولوی عبدالمنان ان کی داڑھی کے بال ان کی پشمینے کی سفید چادر پر جھولتے تھے۔ آنے کے فوراً بعد انہوں نے گھن گرج کے ساتھ اپنا وعظ شروع کر دیا۔

وہ بس بیٹھی ایک ایک صورت تنقیدی انداز میں گھورتی رہی۔ آخر میں اس نے فیصلہ دیا کہ سکینہ جیسی ان میں سے ایک بھی نہیں۔

بیان اتنا طویل ہو گیا تھا کہ اب لوگوں کی توجہ اباسیوں کو روکنے کی طرف زیادہ اور سننے کی طرف کم تھی۔

کوئی ساڑھے گیارہ بجے دادی جواری کے دونوں بیٹوں نے قہوے کے گرم گرم پیالے ہاتھوں میں تھما دیئے۔ قہوے نے اندر جا کر نہ صرف چستی پیدا کی، بلکہ چہروں پر تازگی کی ایک لہر دوڑا دی۔

ایک بجے جب وہ تینوں گھر آئے تو ٹھٹھرتی گٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ابھی دونوں گھروں میں فاصلہ صرف چند گزوں کا تھا۔ لیکن سردی تو نقطۂ انتہا پر پہنچی ہوئی تھی۔

ان کا کمرہ گرم تھا۔ جب سے کہف الوریٰ نے ان کے ہاں رہنا شروع کیا تھا۔ غلام حیدر دوسرے کمرے میں سوتا تھا۔ سکینہ اور وہ پاس پاس لیٹیں، وہ بولی۔

”تی تی آمو! میں تو بہت تھک گئی ہوں۔“

سکینہ نے اپنی رضائی کا کونہ اٹھایا اور کہا ”یہاں میرے پاس آجاؤ۔“

وہ اپنی رضائی سے نکل کر اُس کی رضائی میں آ گھسی۔ سکینہ نے جب اسے اپنے ساتھ لپٹایا، اسے ماں یاد آ گئی۔ کبھی کبھی جب وہ بہت لاڈ لے انداز میں ہوتی تو اس کے ساتھ بستر میں گھس جاتی تھی۔ دیر تک جب اس کی چہلیں ختم ہونے میں نہ آتیں، تب وہ جھلا کر کہتیں ''چل ہٹ اب سونے بھی دے گی مجھے۔''

اس کی آنکھیں گیلی ہوگئیں جب اس نے یہ اپنے آپ سے کہا۔

''قبر میں سوتی ماں یہ نہیں جانتی کہ بیٹی جلے نصیبوں والی نکلی۔''

سکینہ کے ہاتھوں نے جب اس کے بالوں کو پیار سے سنوارا۔ وہ اس کے گریبان سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سکینہ جانتی تھی کہ ماں اور باپ دونوں کو وداع کر بیٹھی ہے۔ اس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''بس صبر کر میری بچی! سمجھ لے ہم تیرے ماں باپ ہیں۔''

وہ سسکیاں لیتی رہی اور سکینہ اپنی گرفت کا دائرہ اس کے گرد تنگ کرتی رہی۔ پھر جیسے اس کا اپنا اندر بلبلا اٹھا۔

''لیکن ایک دن تو بھی چلی جائے گی اور ہم دونوں یہاں آگ کے آگے بیٹھے تجھے یاد کیا کریں گے اور پھر یونہی ایک دن قبروں میں اتر جائیں گے۔''

اور وہ تیز آواز میں بولی۔

''نہیں تی تی آ مو! تمہیں چھوڑ کر اب میں نے کہاں جانا ہے؟''

''بچی! مجھے بہلاتی ہے۔ پنچھی اور پردیسی کب کسی کے میت ہوئے ہیں۔''



ے فنگ کا تہوار اس کی خاموش بظاہر پُرسکون اور ایک کمرے تک محدود زندگی میں ایک لطیف اور پُر لطف سا ارتعاش تھا۔

ایک شام جب وہ سفید اور سرخ لوبیا کی پھلیاں پکانے کے لئے چیر رہی تھی۔ سکینہ پیاز کاٹتی تھی اور وہ کہتی تھی۔

''کمال ہے آمو! یہاں لہسن اور ادرک نہیں ہوتا۔ بھلا لہسن اور ادرک کے بغیر ہنڈیا کا ذائقہ کیا۔ اچھا اب تی تی آ تا سکر دو جائیں گے تو میں کہوں گی تھوڑا اسالے آئیں۔ لہسن کی چٹنی کے ساتھ جو کی روٹی دیکھنا کیسی مزے دار لگتی ہے۔ اور ہنڈیا بھی کھانا۔''

تبھی سکینہ بولی ''لو دیکھو میں تمہیں بتانا ہی بھول گئی کہ ے فنگ کا تہوار آنے والا ہے اس کے لئے کچھ تیاری بھی کرنا ہے۔''

اس تہوار کا پس منظرا سے نہ سکینہ بتا سکی اور نہ ہی غلام حیدر۔

بیس اور اکیس دسمبر کے دن شکپہ (تیزی سے جلنے والی لکڑی) کے ڈنڈے بنانے میں گزرے۔ دادی جواری کے پوتے اور بائیں ہاتھ والے گھر کے لڑکے سابقہ برسوں کی طرح غلام حیدر کے صحن میں جمع تھے۔ ہر لڑکے کی کوشش تھی کہ اس کا شکپہ لمبا اور تراش خراش کے لحاظ سے کچھ دیدہ زیب ہو۔ پولو گراؤنڈ کے پاس ایندھن کا بھی ڈھیر لگ چکا تھا۔ نقطہ انجماد پر پہنچی سردی گو اسے خاصی تکلیف دیتی تھی۔ پر ان دنوں وہ ان سب کے ساتھ ہلہ گلہ کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ چھوٹے لڑکے اُسے پکارتے نہ تھکتے تھے۔

اکیس دسمبر کو سکینہ نے اخروٹ، بادام، گری، دھنیا، پودینہ وغیرہ کو صاف کر کے ان کی چٹنی بنائی۔ بردکے آٹے کے پیڑے اٹھائے انہیں اُبالا اور چٹنی میں ملا کر پڑو پو تیار کیا۔ پھر اس کے ساتھ مل کر گھر کی چھوٹی سی بھٹی میں کلچے تیار کئے۔ کمرے میں گرم گرم کلچوں کی میٹھی میٹھی خوشبوں پھیلی ہوئی تھی۔

وہ چھڑے پر بیٹھی سکینہ سے کہتی تھی کہ اُس نے کلچوں پر خشخاس لگانے میں کنجوسی کی ہے۔ ہنستے ہوئے سکینہ نے بھی جواب میں کہا تھا۔

''تو تمہارے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے کسی نے تم خود چھڑک لیتیں۔''

جب کوئی دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ تی تی آ نا گونج دار آواز میں بولا تھا۔ ''ارے بھئی دیکھو تو کون آیا ہے اور اس ''کون ہے؟'' کو دیکھنے کے لئے جب اس نے نگاہیں اٹھائیں وہ ساری جان سے کانپی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت اور خوف بھی امنڈا تھا۔

''آ ذآ ذ۔'' سکینہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

ڈاکٹر ابراہیم اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

وہ سیاہ چادر اور ملگجے سے کپڑوں میں مکمل طور پر اس ماحول کی پروردہ ایک لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کے لب ساکت تھے۔ آنکھیں خاموش اور دہشت زدہ جذبات کی عکاس تھیں۔

وہ ہنسے اور انگریزی میں اس سے مخاطب ہوئے۔

''بولو تمہیں میرے آنے سے خوشی نہیں ہوئی۔''

وہ اب بھی خاموش تھی۔

''کہف الوریٰ میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔''

اس بار جواب نہ دینے میں اسے خود سے زیادہ اُن کی سبکی کا احساس ہوا۔

اس نے ان کی آنکھوں سے چھلکتی محبت کی کرنوں میں نہانے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل مجھے آپ کی آمد کی توقع نہیں تھی۔''

''تی تی آ تا، غلام حیدر نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں ہر ڈیڑھ دو ماہ بعد، نخچلو سے فرانو تک کا چکر لگاتا ہوں۔ مریضوں کو دیکھتا ہوں۔ زیادہ بیمار مریضوں کو نخچلو لے جاتا ہوں۔ اب بھی اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ سکہ پہنچ کر سوچا، تمہیں دیکھتا چلوں۔''

وہ جانتی تھی، سکینہ نے ایک دن باتوں کے دوران جب اس نے یہ پوچھا تھا، کہ اگر کوئی زیادہ بیمار ہو جائے تو فوری علاج کی صورت میں کیا کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا، خداوند ڈاکٹر ابراہیم کو حیات دے۔ مریض اس کے پاس نخچلو بھاگتا ہے۔

اس کا دل ڈاکٹر ابراہیم کا نام سننے پر بے طرح دھڑکا تھا۔ اسے مزید دھڑکنے سے بچانے کے لئے وہ فی الفور اٹھی اور پانی لانے کے لئے کول کی طرف نکل گئی۔ سکینہ عقب سے چلاتی رہ گئی ''کہاں جاتی ہو۔ پانی تو گھر میں بہتیرا ہے۔''

سکینہ چائے پکانے لگی تھی۔ غلام حیدر ان کے پاس بیٹھا تھا اور وہ سر جھکائے بیٹھی ناخنوں کو کھرچتی تھی۔

وہ دو پیالوں میں چائے لائی۔ چائے کی سطح مکھن سے چمکتی تھی۔ ایک پلیٹ میں پڑ دیو اور دوسری میں کلیجی بھی سامنے رکھے گئے۔ غلام حیدر بصد اصرار انہیں کھلانے لگا۔

''آ تا پہلے یہ تو بتاؤ۔'' ڈاکٹر ابراہیم نے چائے کا چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔ ''اس لڑکی پر تم لوگوں نے کون سا عمل کیا ہے کہ یہ تمہیں چمٹ گئی ہے۔'' دادی جواری گلہ کرتی تھیں کہ ان کے گھر دنوں نہیں جاتی۔

دونوں میاں بیوی زور سے ہنس پڑے۔

اس وقت صحن میں بچوں کی خوشی سے بھرپور آوازیں گونجیں۔ وہ بچے دندناتے اندر آ گئے تھے۔ جو گزشتہ چند دنوں سے اس کے پاس پڑھنے آنے لگے تھے۔

کم و بیش سبھی بچوں نے ڈاکٹر ابراہیم کو ''ڈاکٹر صاحب السلام علیکم کہا''

بعض بچوں نے ہاتھ بھی ملایا۔

اسے احساس ہوا تھا کہ وہ بوڑھوں اور جوانوں کے ہی دوست نہیں، بلکہ بچوں کے بھی ہیں۔

بچے چراغاں کرنے کے لئے جا رہے تھے۔

ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر ابراہیم نے کہا۔

''آپ نہیں دیکھیں گی یہ سب۔''

کچھ دیر وہ اسے دیکھتے رہے۔ پھر اٹھتے ہوئے بولے۔

''آیئے میرے ساتھ۔''

وہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن کھڑے ہو کر انہوں نے دعوت یوں دی کہ انکار کی گنجائش ہی نہ رہی۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے پولو گراؤنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے دھوپ اپنا بوریا بستر سمیٹ چکی تھی۔

ادھر مغرب کی اذان فضا میں گونجی، ادھر ایندھن کے ڈھیر کو آگ لگا دی گئی بچوں نے اپنی اپنی شکپہ جلائی اور ادھر سے فضا میں لہرانے لگے۔ آگ کے آسمان کی بلندیوں کو چھوتے شعلے، لہراتی بل کھاتی شکپائیں، ساری وادی روشن ہو گئی تھی۔

بچوں کی چار ٹولیاں بنیں۔ ایک گیت گانے اور ناچنے میں مصروف ہو گئی۔ دوسری جلتی مشعلیں ہاتھوں میں پکڑے اپنی طرف کے پہاڑوں پر چڑھنے لگی۔ تیسری دریائے شیوق کی طرف بھاگی۔ جہاں دریا پار کے گاؤں مرچھا سے بچوں نے آنا تھا۔ چوتھی گاؤں میں چکر کاٹنے کے لئے دوڑی۔ دور سے جلتی شکپائیں ٹمٹماتے جگنوؤں کی مانند نظر آتی تھیں۔

بہت دیر تک وہ اس تماشے سے محظوظ ہوتی رہی۔ جلتے ایندھن کے ڈھیر نے ان کے قریب کی سردی کو نگل لیا تھا۔

واپسی کے لئے چلنے میں انہوں نے کافی دیر کر دی۔ راستے میں ایک جگہ ٹھہر کر



عجیب سی بات تھی۔ برف باری سے متعلق غلام حیدر اور سکینہ کے سبھی قیافے ایک کے بعد ایک غلط ثابت ہوئے تھے۔ ہر صبح وہ ہنستے ہوئے کہتی۔

''لوتی تی آ تا اور آ مو! تم لوگوں نے تو بس دھوپ میں بال سفید کر لئے ہیں۔

اور وہ دونوں ہنستے ہوئے کہتے۔

''ارے بھئی! تم جو ہر وقت ہمیں ضعیف الاعتقادی کے طعنے دیتی رہتی ہو۔ ہمارے نجوم و جعفر سے وابستگی رکھنے کو تو ہم پرستی قرار دیتی ہو۔ اب ایسے میں قیاس آرائیوں کو تو غلط ہی ہونا ہے۔''

لیکن اس صبح جب اس کی آنکھ کھلی اور اس نے کھٹ پٹ کی آوازیں سنیں۔ غلام حیدر کی یہ آواز بھی اس کے کانوں میں پڑی۔ ''سکینہ اتنا کھڑاک مت کر، لڑکی سوتی ہے۔'' وہ اب بلتی کافی سمجھنے لگی تھی۔

وہ رضائی پرے پھینک کر بھاگی۔ دونوں اوپر کی منزل کی چھت پر سے برف نیچے پھینکتے تھے۔

''اللہ!'' اس نے فضا پر نگاہیں ڈال کر شگفتہ اور مسرور انداز میں کہا۔

کائنات روئی کے گالوں میں لپٹی معلوم ہوتی تھی۔

ساری رات برف باری ہوتی رہی تھی۔ راستے صحن، چھتیں سب اٹے پڑے تھے۔ ۔ د چھتوں کو جلدی جلدی صاف کرنے میں جتے ہوئے تھے۔ فضا بہت دھندلی تھی۔ غلام حیدر کہنہ

تھا "آج دن بھر زور رہے گا۔"

وہ جلدی سے نیچے آئی۔ طاق میں رکھا اس نے اپنا پولا (برف پر چلنے والا جوتا) اٹھایا، پہنا اور تیز تیز چلتی باہر آئی۔ تھوڑی دیر آنگن میں جمی تہہ پر چلی۔ برف ابھی بہت نرم تھی۔ پاؤں اندر دھنس جاتا تھا۔

سکینہ نے اسے یوں تماشے کرتے دیکھا تو چھت پر سے چلائی۔

"چلو اندر آگ کے پاس بیٹھو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی تمہیں۔ تم اس موسم کی عادی نہیں ہو۔"

سارا دن روئی کے گالوں جیسی برف گرتی رہی۔ وہ آگ کے پاس بیٹھی، خوبانیاں کھاتی رہی اور ان سے کہتی رہی۔

"آمو یوں بندھ کر بیٹھنا کس قدر دشوار ہے۔"

ایک دو بار اس نے نکلنے کی کوشش کی کہ وہ دادی جواری کے ہاں چکر لگا لے پر برف باری کی شدت نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔

عصر کے بعد برف باری رک گئی۔ دائیں ہاتھ والا گھر ناصر عباس کا تھا۔ ان کا بیٹا رضا عباس اس کے پاس سائنس پڑھنے آتا تھا۔ مغرب سے ذرا پہلے وہ آیا اور بولا۔

"آمو کہتی ہیں آپ سکینہ آمو رات کو ہمارے ہاں آئیں۔"

سکینہ عشاء کی نماز سے جب فارغ ہوئی تب وہ دونوں رضا عباس کے گھر گئیں۔ محلے کے بیشتر لوگ جمع تھے۔ کہانی سننے کا پروگرام تھا۔ دادی جواری کی منجھلی اور چھوٹی بہو زینب بھی موجود تھیں۔ دونوں اون ساتھ لائی تھیں اور اب کاتنے کا بھی پروگرام تھا لیکن چرخہ دیکھ کر تو وہ حیران رہ گئی۔ ڈیڑھ بالشت لمبا لکڑی کا ایک تراشیدہ ٹکڑا جس کا اوپر کا سرا نوکدار اور لمبا، سینٹر تھوڑا سا موٹا نچلا سرا اوپر کی نسبت ذرا زیادہ موٹا اور کم نوکدار۔ "ارے وہ حیرت سے بولی۔

"چلو ذرا مجھے کات کر دکھاؤ۔"

زینب نے پھولی ہوئی پھونی اٹھائی۔ اس میں سے ایک تار نکالی۔ اسے نوکدار سرے

پر لپیٹ کر مہارت سے آناً فاناً باریک اور لمبی لمبی تاریں نکالنی شروع کر دیں۔

''کمال ہے'' وہ ہنسی۔ پر جب اس نے خود ایسا کرنا چاہا تو کر نہ پائی۔ ساری عورتیں ہنسنے لگی تھیں۔ رضا عباس کی ماں اس کے آگے پیچھے بچھی جاتی تھی۔

یہاں پھنگ (بلتی چرخہ) کے گھنگرو نہیں تھے کہ زینب جیسی ٹمیار جھومتے ہوئے گاتی۔

میرا چرخہ کردا گھوں گھوں گھوں

پھر عباس نے کہانی شروع کی۔ وہ یقیناً ایک کامیاب داستان گو تھا۔ کسیر کی کہانی جب دیوتا کسیر کی شادی سوئمبر کے نتیجے میں ہلانو بلونگمو کے ساتھ طے پا گئی۔ اس وقت دیوتا کسیر ایک نہایت بدصورت اور گندے گونگے کی شکل میں تھا۔ اس لئے نہ تو بلونگمو کو پتہ تھا؛ ورنہ ہی باقی لوگوں کو کہ یہ بدصورت گونگا دراصل دیوتا کسیر ہے۔ جب ہلانو بلونگمو قانوناً اس کی بیوی قرار پائی تو وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ ہلانو کو اس بات کا شدید صدمہ ہوا اور اس نے اسے بحیثیت خاوند قبول نہ کیا۔ رواج کے تحت وہ اس کے گھر سے کہیں اور جا سکتی تھی۔

ایک دن ایک بڑھیا ہلانو کے بال سنوار رہی تھی۔ ہلانو نے اس سے ذکر کیا کہ اس کی بدنصیبی نے اسے کیسا شوہر دیا ہے۔ بڑھیا نے کہا ''میں نے سنا ہے کہ یہ گونگا دراصل دیوتا کسیر ہے جو اپنی مصلحت کی خاطر اس گھٹیا روپ میں ہے۔ ہلانو نے جب اس کی بات کی تردید کی تو وہ بولی۔ میں نے سنا ہے کہ ہر جمعرات کو ہلو کے میدان میں تمام دیوتا اور پری زاد اپنے اپنے اصل روپ میں ظاہر ہوتے ہیں اور مختلف کھیل کھیلتے ہیں۔

اب ہلانو جمعرات کی صبح کو سویرے سویرے اس میدان میں گئی اور ایک گڑھا کھود کر اس میں بیٹھ گئی۔ اوپر تنکوں اور گھاس سے زمین کو ہموار کر دیا۔ جب سورج کی کرنیں پہاڑوں پر پڑیں تو ہلانو نے دیکھا اس کا گونگا خاوند اس میدان کی طرف آ رہا ہے۔ ہلانو دھڑکتے دل سے دیکھتی رہی۔ جب گونگا اس میدان کے عین درمیان میں پہنچا تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک نہایت ہی حسین وجمیل اور وجیہہ شکل دیوتا میں بدل گیا اور ایک شاندار گھوڑے پر نظر آیا۔ اس

کے ارد گرد اور بہت سے خوبصورت افراد گھوڑوں پر سوار تھے۔

ہلانو کو اب یقین ہو گیا کہ اس کا گونگا شوہر واقعی دیوتا کسیر ہے اور وہ اپنے اصلی روپ میں سامنے کھڑا ہے۔

وہ فرطِ مسرت سے سرشار ہو گئی اور فوراً ہی گڑھے سے نکل کر اسے پکارنے لگی۔ اس کا پکارنا تھا کہ اس میدان میں ایک جھکڑ چلا اور گرد و غبار چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب گرد و غبار ختم ہوا تو دیکھا کہ اس میدان میں کوئی نہیں تھا۔ صرف اس کا گونگا خاوند ہے جو چلا آ رہا ہے۔ ہلانو اب گونگے کی طرف بھاگی۔ اسے گلے سے لگایا، چوما اس کی بلائیں لیں اس کے چہرے سے میل اور گندگی صاف کرنے لگی اور اس کی تعریف میں گانے لگی۔

ہلو دی تھنگ پونیکو سے سونا سے سور گا شا

رکیا نکو ہیلیا جونے نی ہلا فور کسیر رگا شا

ہلو دالے میدان میں اگر کوئی خوب صورت ہے تو کون ہے

ہیلیا گھوڑے پر سوار میرا دیوتا کسیر خوب صورت ہے

اب گونگا بھی اپنی بیوی کی تعریف میں گانے لگتا ہے

ہلو دالے میدان میں اگر کوئی حسین ہے تو کون ہے

برفانی پہاڑ پر شفق کی سرخی کی طرح میری دیوی بلونگمو حسین ہے

کہانی، کچھ تو اس نے خود سمجھی اور کچھ زینب نے وضاحت کی۔ اس کے اس استفسار پر کہ اس کہانی کا پس منظر کیا ہے۔ زینب بولی تھی۔

''دراصل بلتستان کے باشندے اس کرہ ارض پر انس وجن کے علاوہ بلہ ھلو نامی ایک بابرکت جنس کے وجود کے معتقد ہیں۔ ہلانو بلونگمو اور ہلانو کسیر اسی جنس کے افراد ہیں۔ دراصل یہ اشاعت اسلام سے قبل کے دیوی دیوتاؤں کے تصورات ہیں جو ابھی تک اذہان سے رفع نہیں ہوئے۔ کسیر کی کہانیاں لداخ کی طرف بُودھوں کے پاس مقدس مذہبی منظوم کتاب

کی صورت میں موجود ہیں۔

ناصر عباس کا کہانی سنانے کا انداز حقیقتاً غضب کا تھا۔ جب ہلانو بلونکمو دیوتا کسیر کے ساتھ رکھائی اور نفرت کا برتاؤ کرتی ہے۔ کہانی کے اس ٹکڑے کو اس نے مظلوم صورت میں پیش کیا۔ ایک تو اس کی پاٹ دار پُر سوز آواز دوسرے چیلو کی میٹھی بلتی زبان دونوں نے مل کر سماں باندھ دیا تھا۔

اور جب وہ سب قہوہ پیتے تھے ناصر عباس اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ کے بھی کچھ پلے پڑا کہ نہیں؟''

اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور زینب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''کچھ تو خود پڑا اور کچھ استاد نے ڈالا۔''

یہ رات بہت خوش گوار گزری۔ ایک بجے گھر آ کر وہ جب سونے کے لئے لیٹی تو اسے فوراً نیند آ گئی اور وہ دن چڑھے تک دُھت سوتی رہی۔

چند دنوں بعد ایک دن موسم صاف ہوا۔ اس نے غلام حیدر سے کہا۔

''آ تا چلو نا ہم سکساری ژھر (پہاڑی باغ) دیکھنے چلیں زینب اس سیرگاہ کی بہت تعریف کرتی ہے۔''

غلام حیدر فوراً بولا۔

''کل پر رکھ لو۔ زینب اور دولت بی بی (رضا عباس کی بہن) کو بھی تیار کر لو۔''

ناصر عباس نے کہیں سے جیپ کا بندوبست کیا۔ زینب سکینہ وہ دولت بی بی اور رضا عباس کے چھوٹے بہن بھائی سب اس میں لد گئے۔

راستے میں غلام حیدر نے کہا'' دراصل ان جگہوں پر سیر کا حقیقی لطف گرمیوں میں آتا ہے۔''

چشمے ری ژھر ایک آبشار کی صورت میں بہتا تھا۔ جھاگ اڑاتا، بھاپ کے بگولے

چھوڑتا یہ پانی اتنا گرم تھا کہ جب اس نے ہاتھ ڈالا تو فوراً نکالنا پڑا۔ آبشار تقریباً سوفٹ بلندی سے گرتی تھی۔ چشمے کے پانی کے ساتھ ساتھ پن چکیاں لگی ہوئی تھیں۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

وہ ہنسی۔ اسے ہنستے دیکھ کر وہ بھی ہنسا اور بولا "جب میں سیالکوٹ میں تھا، تو ہمارے مالک مکان کا لڑکا یہ نظم پڑھا کرتا تھا۔ میں جب بھی کوئی پن چکی دیکھتا ہوں، مجھے وہ لڑکا یاد آجاتا ہے۔

ری ڑھر کے درخت گھاس پھل پھول سب پر ویرانی تھی۔

یہاں دھوپ تھی۔ وہ سب دھوپ میں بیٹھے۔ انہوں نے کھانا کھایا۔ چائے پی اور غلام حیدر نے پھر کہا۔

"تم نکلی ہوئی تو ہو چلو تمہیں اپو کھر اور کچھے کھر دکھا دیں۔"

پر کھر کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر کوفت اور بیزاری کے عکس جھلملا گئے غلام حیدر ہنس کر بولا۔

"تم ہمارے کھروں سے اتنی بیزار کیوں ہو؟"

اور اس نے جواباً سر کو طنزیہ انداز میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹوٹے پھوٹے کھر لئے بیٹھے ہیں۔ سنبھال کر کوئی رکھا۔"

"واقعی اچھا چلو تمہیں سکسہ کی بڑی جامع مسجد دکھاتے ہیں۔ وہاں نفل بھی پڑھ لینا اور فن نقش کاری کے نمونے بھی دیکھ لینا۔ اور یہ بھی جان لینا کہ ایسا آرٹ تمہیں کہیں نظر نہیں آئے گا۔"

"وہ تو میں پہلے ہی جان بیٹھی ہوں۔"



یہ مختصر سا خط اُسے اس وقت ملا تھا جب وہ غلام حیدر اور سکینہ کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی تھی۔ غلام حیدر اس وقت گوتب اور سکل تب (کاشت کا پہلا اور درمیانہ وقت) کا حساب لگاتے ہوئے اسے بتا رہا تھا کہ فصل ربیع کی کاشت انتہائے فروری سے مارچ کے اواخر تک ہوتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مارچ کا پہلا ہفتہ گوتب کے لئے چنتا ہے۔ ان دنوں وہ اپنے گھوڑوں کی بہت سیوا کرتا تھا۔ اس کے لئے یہ بات انتہائی تعجب خیز تھی کہ چھور بٹ میں لوگ کھیتوں میں ہل چلانے اور کھلیانوں میں فصل کی چھانٹی کے لئے گھوڑے استعمال کرتے ہیں۔ غلام حیدر کے گھوڑے سانڈوں کو مات کرتے تھے۔

اور جب غلام حیدر وس جنوری، کو کتے کی گرمی کہم فروری کو گرمی خانہ، بیس فروری کو گرمی زمین کے اپنے بلتی حساب کتاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ سکینہ جماوی الثانی کے ان دنوں کے ہیر پھیر میں الجھی ہوئی تھی کہ جو حضرت فاطمۃ الزہرا کی وفات وولاوت کے تھے۔

تبھی وادی جواری کا پوتا محمد جعفر کا بیٹا وہ خط لایا تھا اور اس سے بولا تھا۔

''چھغو آ تا نچلو سے لائے ہیں۔''

پل بھر کے لئے اس کا دل نچلو کے نام پر دھڑکا۔ پر جب اس نے کھول کر پڑھا وہ شاہ جہاں کا تھا۔ جس نے اسے لکھا تھا کہ وہ مارچ کے پہلے ہفتے کھر منگ جا رہی ہے۔ پھوپھی فاطمہ بیگم کے دو خط آ چکے ہیں۔ انہوں نے تمہارے لئے بھی لکھا ہے۔ نوروز کا تہوار کھر منگ ہی میں منانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ کتنا اچھا ہو کہ اگر تم اس سفر میں میری ساتھی بنو۔''

شاہ جہاں کی اردو جتنی اچھی بول چال میں تھی، اتنی تحریر میں نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی غنیمت تھی۔ سکینہ سوالیہ نگاہیں اٹھائے اس کی طرف دیکھتی تھی۔ وہ بولی۔

''نجیلو کے راجہ فتح علی خان کی بہو کا خط ہے۔ اس نے نجیلو آنے اور اور کھرمنگ چلنے کے لئے لکھا ہے۔''

اور اس نے دیکھا سکینہ نے یوں جھٹکا کھایا جیسے کوئی بجلی کی ننگی تاروں سے چھو جائے۔

''ارے آ موا تم گھبرا گئی ہو۔ میں نے کوئی جانے کا کہا ہے۔''

سکینہ کی آنکھوں میں اس وقت آنسو اُتر آئے اور غلام حیدر اٹھ کر باڑے میں مویشیوں کو دیکھنے چلا گیا۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کا گال چومتے ہوئے بولی۔

''کمال ہے۔''

''میری بچی، تمہیں آخر کو تو جانا ہے تاہم بھی بس پاگل ہیں تم سے اتنا پیار کر بیٹھے ہیں۔''

اس نے اپنی لانبی پوروں سے سکینہ کی آنکھوں میں تیرتے پھرتے پانی کو گالوں پر لا کر جذب کیا اور قدرے گلوگیر آواز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''کوئی ضروری ہے کہ انسان خونی ناتوں کے لئے ہی تڑپتا پھرے۔ کچھ بظاہر گہرے واسطے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سالہا سال ساتھ رہنے پر بھی اندر اپنی جڑیں مضبوط نہیں کر پاتے اور کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ اجنبی جگہیں اور اجنبی لوگ حوادث اور اپنوں کی عطا کردہ جہنم کی آگ میں جلتے بھنتے لوگوں کو اپنے پیار کی بارش میں یوں نہلا دیتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے ٹھار ہو جاتے ہیں۔''

''آ موتم کیا سمجھتی ہو، میں یہاں سے جا کر پھر نہیں آؤں گی۔ اگر ایسا سوچا ہے تو بہت غلط سوچا ہے۔ مجھے تو یہاں بار بار آنا ہوگا۔ اس لئے کہ میں یہ جان پائی ہوں کہ میرے باوا اور

ماں نے غلام حیدر اور سکینہ کے روپ میں سکمہ میں پھر جنم لے لیا ہے۔''

پھر وہ اٹھی۔ اس نے چائے بنائی اور جب اس نے غلام حیدر کو آواز دی۔ آ تا آ و نا

چائے کی ایک پیالی پی لو۔'' وہ نیچے باڑے میں سے بولا تھا۔

''تم پیو، میں یہاں مصروف ہوں۔''

اور اس نے غصے سے زوردار آواز میں کہا تھا۔

''نہیں آ ؤ گے تو میں ساری چائے گرا دوں گی۔''

اور وہ فوراً سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آ گیا تھا۔

اور چائے پیتے ہوئے سکینہ نے کہا تھا۔

''بہر حال میں آل مطہرہ حضرت فاطمۃ الزہرا کی ولادت کی تقریب سعید سے پہلے تو تمہیں نہیں جانے دوں گی۔''

بیس جمادی الثانی کو سکینہ کے گھر قصیدہ خوانی کی محفل منعقد ہوئی ایسی محفلیں مقامی زبان میں عید کہلاتی ہیں۔ اس دن وہ خاصی مصروف رہی۔ سر پر چادر اوڑھے، آنکھوں میں عقیدت کی مشعلیں جلائے اس نے سکینہ کو سب ذمہ داریوں سے فارغ رکھا۔ رات کو سکینہ اس کا ماتھا چوم کر بولی۔

''دیکھو ماں کہا ہے تو ماں کی طرح یاد رکھنا ہے۔''

شاہ جہاں کا ایک اور خط آ گیا تھا۔ اس میں غصہ بھی تھا اور تاکید بھی اور فی الفور پہنچنے پر اصرار بھی۔

یہ حقیقت تھی کہ اسے سکمہ سے جانے کا قلبی دکھ تھا۔ یہاں وہ اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ اسے بہت کم یہ بات یاد آتی تھی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے اور کیوں یہاں رہ رہی ہے؟ ڈھیر سارے بچے اس کے پاس پڑھنے آنے لگے تھے۔ دن کا آدھا حصہ انہیں پڑھانے میں گزر جاتا بڑی جماعتوں کے لڑکوں کو وہ حساب اور انگریزی میں بہت توجہ دے رہی تھی۔ یہ

وہ اپنے دل میں ٹھان بیٹھی تھی کہ بس زندگی اب یوں انسانوں کی فلاح میں گزار دے گی۔ پڑھنے والے بچے بھی بہت ملول تھے۔ ان کے والدین بھی افسردہ تھے اور وہ ان سب کو دلاسا دیئے جاتی تھی کہ گھبرانا نہیں میں جلد لوٹوں گی اور تمہاری ساری کمی انشاءاللہ دور کردوں گی۔

اور جب وہ جیپ میں بیٹھی اس نے پاس کھڑے غلام حیدر اور سکینہ کی طرف قصداً نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں پر کیا اس کی تو اپنی آنکھیں بس برس جانے پر تلی بیٹھی تھیں۔ جانے وہ کس ضبط سے ان پر قابو کئے ہوئے تھی۔

اور جب وہ جہلم کی طرف رواں دواں تھی، اس نے اپنے دل میں ایک بار نہیں کئی بار کہا تھا۔

''پروردگار، میرا سامنا ڈاکٹر ابراہیم سے نہ ہو۔''



گوشت اگر جل بھی جائے تب بھی چنے کی دال سے پھٹ (خراب) نہیں ہوتا۔
پنجابی زبان کا یہ محاورہ اپنے گھر میں جانے اُس نے کتنی بار سنا تھا اور سن کر ہوا کی طرح سر سے گزارا تھا۔ پر اس کا مطلب اس کا صحیح مفہوم اور اس کی گہرائی اس پر اس وقت آشکارا ہوئی تھی جب وہ کھر منگ جانے کے لیے جیپ میں بیٹھی۔ شاہ جہاں کے ساتھ پورا لشکر کوچ کر رہا تھا۔ اس کا خاص نوکر، نوکرانی چھوٹا خادم لڑکا لڑکی، بے شمار سامان۔

''میرے مولا! تم اپنی پھوپھی کے گھر چند دن گزارنے جا رہی ہو، یا کسی محاذ پر لشکر کشی کا منصوبہ ہے۔ یا خدا اس قدر کھڑک کھڑاک۔ جیپ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں اللہ کی بندی اس قدر تام جھام کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

''سنو! اپنی اس بکواس کو بند کر کے کچھ میری بک بک سننے کی تکلیف بھی گوارہ کر و گی۔ دیکھو میں آخرچلو کے سابق رعجہ کی بہو ہوں۔ تم جیسے اٹھائی گیروں کی طرح بیگ کندھے سے لٹکا کر مارچ نہیں کرسکتی۔ وضعداری کا بھرم رکھنا پڑتا ہے۔''

''جہنم میں گئی تمہاری وضعداری بولو، بتاؤ بیٹھوں کہاں ہمسائے میں رانی جی کی شان و شوکت کے نمائندہ پٹارے دھرے ہیں۔'' اس نے شاہ جہاں کے شانوں پر زبردست قسم کا تھپڑ جمایا تھا۔

دراصل اسے شاہ جہاں کی اس درجہ تیاریوں کا ذرا سا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ ایک دن پورا وہ اس کے گھٹنے سے گھٹنا جوڑے بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ دوسرا دن اُس کا ڈاکٹر سیف

اللہ کے گھر گزرا۔ جہاں اس نے سیماں سے فون پر لمبی چوڑی باتیں کی تھیں۔ اس کی ناراضگی اور گلے شکوؤں کو دور کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ تیسرا دن ڈاکٹر اسماعیل کی بیوی بچوں کے سر چڑھ گیا۔ ڈاکٹر ابراہیم ڈغونی گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے چچا بیمار تھے۔

اور اس نے ایک بار نہیں، کئی بار خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

چوتھے دن وہ صبح سویرے روانگی کے لیے تیار تھیں۔ ڈرائیور کے ساتھ وہ اور شاہ جہاں بیٹھیں پیچھے نوکروں نے سنبھالے۔

براہ میں انہیں رکنا پڑا۔ شاہ جہاں کے ملازم کی بہن یہاں رہتی تھی۔ وہ اسے ملنا چاہتا تھا۔ یہ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ لوگ کھیتوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ براہ کی زمین بہت زرخیز اور بہترین ہے۔ براہ کے عام لوگوں کے دروازے اور کھڑکیاں چوب کاری کے بہترین نمونے تھے۔ دور سے دیکھنے پر بھی نہایت دل کش نظر آتے تھے۔

جب وہ سکردو سے چلو آئی تھی، تو دریائے شیوق کے پار سڑک پر سفر ہوا تھا۔ اب دریا کی سمت تھی۔ غواڑی میں پہنچ کر شاہ جہاں نے ڈرائیور اور نوکروں سے کہا کہ وہ اس چھوٹے سے ہوٹل سے چائے پی لیں جو مسافروں کے لیے بنا ہوا تھا۔

خود اس نے تھرموس نکال کر چائے کے دو کپ بھرے ایک خود لیا اور دوسرا اسے تھمایا۔

چائے پیتے پیتے وہ بولی۔

''یہاں اہل حدیث کا ایک بہت بڑا ادارہ مرکزی دارالعلوم کے نام سے کام کر رہا ہے۔ تم جا کر اسے دیکھ آؤ۔''

بلتستان کا یہ سب سے بڑا دینی ادارہ غواڑی میں سڑک کے کنارے پر واقع ہے۔ وہ جب وہاں پہنچی ادارے کے سرپرست شیخ عبدالرشید تعمیر کا کام کروا رہے تھے۔ لمبی چوڑی دو منزلہ عمارت جس میں کوئی تین سو کے قریب بچے زیر تعلیم تھے۔ حدیث، فقہ، فلسفہ اور تصوف پر تحقیقی کام ہوتا ہے۔ طلبہ فارغ التحصیل ہو کر جب نکلتے ہیں تو ان کی تعلیمی استعداد ایم۔ اے

کے برابر ہوتی ہے۔ غواڑی جیلو کی آخری وادی تھی۔ ہمایوں پل پر انہوں نے جیپ روک دی۔ وہ اتر پڑے۔ شاہ جہاں کی بیٹیاں سڑک کو اپنے منے منے پاؤں سے کوٹتی پھرتی تھیں۔ وہ سب اس جگہ کی طرف چلے جہاں دریائے شیوق دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ یہ نظارہ بھی کس قدر دل کش تھا۔ مارچ کی خنکی سے لبریز ہوائیں، کوہ کیلاس کی جھیل مانسرور سے نکلے ہوئے دریائے سندھ اور سیاچن گلیشیر کی جھیل خمزان سے نکلے ہوئے دریائے شیوق کے پانیوں پر سے تیرتی ہوئی ہوا آ کر ان کے چہروں سے ٹکراتی تھیں۔ دھوپ میں پتھروں پر بیٹھ کر سناٹے کے دبیز خلا میں غرق ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ وہ اور شاہ جہاں چپ چاپ نیالے سیمنٹ گھلے پانیوں کو دیکھتی رہیں۔ جب ڈرائیور نے کہا۔

''آپ اب اٹھئے! ہمیں کھرمنگ کے لئے مڑنا ہے۔''

سکردو جانے والی سڑک کو چھوڑ کر اب وہ کھرمنگ کی طرف رواں دواں تھے۔ شاہ جہاں کی بچیاں ابھی کچھ دیر اور وہاں گزارنا چاہتی تھیں۔ اسی لئے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اور بیٹھ کر بھی شور مچائے جا رہی تھیں۔

شاہ جہاں کی زبردست ڈانٹ پر ان کے شور و غوغا میں کچھ کمی ہوئی۔

اب ان کے ساتھ دریائے سندھ چل پڑا تھا۔ کشادگی کی بجائے تنگی کا احساس ہوتا تھا۔

شاہ جہاں بتاتی تھیں۔

اس وادی کا بالائی حصہ ہمالیہ کے اندر واقع ہے۔ جبکہ پائینی علاقے ہمالیہ اور قراقرام کے درمیان واقع ہیں۔ اس کا پرانا نام کرتخشہ ہے۔ لیکن ماضی میں سکردو کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس علاقے میں متعدد قلعے اور فوجی چوکیاں تعمیر کی گئیں۔ اسی نسبت سے اس علاقے کا نام کھرمنگ یا زیادہ قلعوں کا علاقہ قرار پایا۔ یہ سرمک سے شروع ہو کر اولڈنگ تک دریائے سندھ کے آر پار آباد ہے۔ اس وادی کے تین گاؤں ہندور موکرکت اور مزبرا ۱۹۷۱ء سے ہندوستان کے قبضے میں ہیں۔

''اس کے قبضے میں کیوں ہیں؟'' وہ جیسے تڑپ کر بولی ''وادی نیلو کے بھی تین گاؤں پر اس کا قبضہ ہے۔''

اور شاہ جہاں نے لمبی سانس بھر کر کہا تھا۔

''اب بھلا میں کیا بتاؤں کہ کیوں ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ۔ بہت گہرے زخم دے کر گئی ہے۔''

شاہ جہاں کی سوچ میں قومی المیے کا گہرا کرب اس پر آج ظاہر ہوا تھا۔

''ہم بہت بدنصیب ہیں شاہ جہاں۔ آزادی کے دیئے روشن رکھنے کے لئے ان میں جو تیل ڈالنے کی ضرورت ہے، ہم ان میں وہ ڈالنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ ایسے میں وہ کب تک جلتے رہیں گے۔''

سرمیک کا گاؤں آیا۔ شاہ جہاں نے کہا۔

''اگر بھوک محسوس کرتی ہو تو کچھ کھا پی لیتے ہیں۔''

کھرمنگ کی وادی تنگ ہے۔ پہاڑ امنڈے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

پھر مہدی آباد کی وادی آئی۔ دریا پار پنداہ کا گاؤں تھا۔ یہاں انہوں نے ایک کھلی جگہ پر گاڑی روکی۔ نوکروں نے بچوں کو نیچے اتارا۔ وہ دونوں بھی اتر آئیں۔ صاف ستھری سی جگہ کا انتخاب ہوا۔ شاہ جہاں نے کپڑا بچھا دیا۔ کھانا کھولا اور وہ سب دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کھانے میں جت گئے۔

کھاتے کھاتے دفعتاً شاہ جہاں نے کہا۔

''کھرمنگ کا راستہ خاصا خطرناک ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے تم نے کسی خوف اور ڈر کا اظہار نہیں کیا۔''

''اب کب تک ڈرتی رہوں گی۔ عادی ہو گئی ہوں۔ یوں بھی زندگی سے پیار اگر کم ہو جائے تو خوف یا ڈر خود بخود بھاگ جاتے ہیں۔''

''خدا کی قسم تم جیسی گھنی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ مجال ہے جو کچھ اگلے۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''بھی اندر کچھ ہوتو باہر آئے۔تم خوامخواہ تجسس میں مبتلا رہتی ہو۔''

غاسینگ اور مغنھوٹک کی وادیاں گزر گئیں۔ پارسیندو اور کشرا کے گاؤں بھی اس نے شاہ جہاں کی نشاندہی پر دیکھے۔

پہاڑوں پر جمی برف کا پگھلاؤ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ٹنڈ منڈ درختوں کی کونپلیں ابھی پھوٹنی شروع ہوئی تھیں۔لیکن کسان زمین کا پتھریلا سینہ شق کرنے میں پوری ہمت سے جتا ہوا تھا۔

کمنگو میں پہنچ کر شاہ جہاں نے ڈرائیور سے گاؤں میں چلنے کو کہا۔اس نے جب گاڑی موڑی تو وہ بولی۔

''اس گاؤں میں میری انا رہتی ہیں۔ جب بھی کھرمنگ آؤں انہیں ملے بغیر نہیں جاتی ہوں۔''

کمنگو بہت خوب صورت وادی ہے پر ایک بات اس نے محسوس کی کہ بیشتر مکان نو تعمیر شدہ تھے۔ کئی جگہ ٹوٹ پھوٹ تھی اور جب اس نے اس بارے میں استفسار کیا تو شاہ جہاں نے بتایا۔

''دو سال قبل یہاں زبردست قسم کا سیلاب آیا تھا۔ گلیشئیر کے تودے پہاڑوں سے گرے اور انہوں نے پوری بستی تہس نہس کر دی تھی۔'' خدایا''!اس نے جھرجھری لی۔

''میری ہوش میں یہ پہلی ہولناک تباہی تھی۔حکومت نے فوری اقدامات کئے اور بچے کھچے لوگوں کو دوبارہ آباد کیا۔ دیکھو بچنے والوں میں یہ میری انا اور اس کا پورا خاندان بھی ہے۔''

اس نے ڈرائیور کو گھرمنڈنگ میں گاڑی لے چلنے کو کہا۔

دو منزلہ گھر کی چار سیڑھیاں چڑھ کر وہ گھر میں داخل ہوئے۔شاہ جہاں کی انا بی اپنے پوپلے منہ کے ساتھ ہنستی مسکراتی فوراً کمرے سے نکل آئی تھی۔

اس نے شاہ جہاں کو چھاتی سے چمٹا کر پیار کیا۔اس کے بچوں کے ماتھے چومے۔اس

سے ہاتھ ملایا۔

کمنگو سے طولتی دو کلو میٹر آگے ہے۔ طولتی تحصیل ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔

سرکاری ملازمین کی رہائش گائیں، ضلعی دفاتر، اسپتال سکول سب یہیں ہیں۔

طولتی کے بالمقابل پاری کا گاؤں ہے۔ غنڈوس بھی سندھ پار ہے۔

اور جب شام ڈھلے وہ پہاڑی پر ایستادہ راجہ کھرمنگ کے محل میں داخل ہوئی، اس وقت اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کا جسم گنڈاسے سے چار ٹوٹے کر دیا ہو کہ ہر ٹوٹا اپنے اپنے درد کو اسے بتانے میں پیش پیش تھا۔



کھر منگ کا راجہ خاندان اپنے خلوص کی مٹھاس اور اپنائیت کی خوشبو کے لئے اپنی بے حد زرخیز اور مردم خیز وادی پارس کے مشہور سیبوں جیسا تھا۔ پورا گھرنہ صرف اردو سمجھتا تھا بلکہ ستھری اردو بولتا بھی تھا۔ مہارانی سے تو وہ نپلو میں بھی مل چکی تھی۔

مسلسل تین دنوں سے فاطمہ بیگم شاہ جہاں سے سمن سیر گاہ میں چلنے کا کہہ رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی بیٹی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ چوتھے دن وہ خود بول پڑی۔

''تم مجھے محل کی ان دیواروں میں مقید کرنے کے لئے لائی تھیں نکلو باہر گل کو میں خود سنبھال لوں گی۔''

اور سمن جانے کا پروگرام طے پا گیا۔ شام کو شاہ جہاں نے قدیمی قلعہ کھر منگ بھی چلنے کا کہا۔ کھر منگ کے نام پر اس نے فوراً کہا۔

''یہ تم کھر دوں کو چھوڑو۔ کوئی ڈھنگ کی شے دکھانی ہے تو دکھادو۔''

شاہ جہاں یقیناً اس کا جواب دیتی، پر اسی وقت نوکر نے اسے آواز دی تھی۔ منجھلی بیٹی نے بے چارے دھان پان سے نوکر کے نتھنوں میں مہار تو عرصے سے ڈالی ہوئی تھی۔ پر کھر منگ آ کر تو کھینچا تانی یوں شروع کر دی تھی کہ بے چارہ بلبلا اٹھا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کی فریاد سن کر کہا۔

''جاؤ اسے سومہ کھر کے کھنڈروں میں پھینک آؤ۔ جنگلی درندے مزے مزے سے کھائیں گے اسے۔''

بچی وہل کر مہارانی فاطمہ بیگم کے سینے سے چمٹ گئی۔

تیاری کرنا شاہ جہاں پر ختم تھا۔ صبح کوئی نو بجے چلے۔ جیپ چھوٹی تھی بس شاہ جہاں اس کے بچے، وہ اور دو نوکر ہی بیٹھ سکے۔

روصوبخہ گاؤں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر سمن سیرگاہ واقع ہے۔ روصوبخہ کی وادی میں سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر اسے احساس ہوا تھا کہ بہار آ رہی ہے۔ بادام کے درختوں نے سفید پھولوں کے گہنے زیب تن کر لیئے ہیں۔ خوبانی اور آڑو گلابی شگوفوں کے بوجھ کو تمکنت سے اٹھائے کھڑے تھے۔ شاہ بلوط کی عریانی اب کچھ کچھ تن ڈھانپنے لگی تھی۔

سمن نہایت پرفضا مقام ہے۔ دور دور تک سبزہ نظر آتا تھا۔ جو زمین میں سے اپنا تھوڑا تھوڑا سر نکال رہا تھا۔ مختلف پھولوں کی مختلف اقسام کے متعلق ڈرائیور نے بتایا تھا کہ جب کھلتے ہیں تو اس جگہ پر جنت کا گمان ہوتا ہے۔

بید کے درختوں کے نیچے ایک بلجگراہ (چوپال) بنا ہوا ہے شاہ جہاں اور وہ دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئیں۔ دائیں بائیں کا نظارہ اتنا دلفریب تھا کہ وہ کتنی دیر تک ان میں گم رہی اور چونکی تو اس وقت جب شاہ جہاں نے نوکروں کے ساتھ مل کر اونچے اونچے وہ خاص ورود پڑھنا شروع کر دیا تھا جسے کہ بربیب کہتے ہیں۔

وہ حیرت زدہ سی رہ گئی کہ یہ ایکا ایکی اسے ہوا کیا۔ اس وقت سیرگاہ میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے شاہ جہاں کی چادر کھینچی اور کہا۔

''خدا کے لئے ہوش میں رہو۔''

شاہ جہاں نے ایک لحہ توقف کرتے ہوئے کہا۔

''بس دیکھتی جاؤ اور بولو کچھ مت۔''

اب اس کی آواز میں اور تیزی آ گئی۔ نوکروں نے بھی جھوم جھوم کر ساتھ دیا۔ سارے سمن میں ان کی آوازیں گردش کر رہی تھیں۔

پھر یوں ہوا دور پار سے آوازیں آئیں۔ وہ آوازیں جب اور قریب آئیں تو معلوم ہوا کہ مقامی لوگ جوابی درود پڑھ رہے ہیں۔ دو عورتیں اور تین مرد اور کئی بچے دکھائی دیئے۔ عورتوں کے ہاتھوں میں دودھ کے برتن تھے۔

پاس آکر انہوں نے دودھ کے برتن رکھے۔ بر جیب پھر پڑھا۔ شاہ جہاں سے گلے ملیں۔ وہ اٹھی، اس سے بغل گیر ہوئیں۔ پھر انہیں وہ دودھ پیش کیا گیا جو وہ لائی تھیں۔ شاہ جہاں نے پیا بچوں کو پلایا۔ اس نے بھی پیا۔

وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی کیسی دلچسپ اور پیاری رسم ہے۔ اس نے بے اختیار سوچا۔

مرد چلے گئے عورتوں کو اس نے روک لیا۔ ایک جوان تھی اور ایک معمر دونوں کے درمیان رشتے کی نوعیت عجیب سی تھی جوان عورت بوڑھی عورت کی بیٹی کی سوت تھی۔

پاؤں سے ننگی بوسیدہ اور خستہ کپڑوں میں لپٹی وہ نوخیز لڑکی جو ہنستی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صحدم گلاب کا نوشگفتہ پھول اپنے دامن پر شبنم کے موتیوں کے ساتھ مسکرا رہا ہو۔ اس کا جی چاہا اپنی جوتی اس کے پاؤں میں پہنا دے۔ بھلا اتنے خوب صورت اور گداز پاؤں پتھروں پر رگڑیں کھانے کے لئے تھوڑی بنے تھے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ شاہ جہاں جیسی ڈکٹیٹر سے اسے ڈر لگتا تھا۔ اپنی یہ سوچ اگر وہ اس پر عیاں کر دیتی تو اس نے یقیناً یہی کہنا تھا۔

''ارے کس کس کو پہنائے گی تو۔ اس سرزمین کے خوب صورت پاؤں کے مقدروں میں پتھروں سے ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔ تو مقدر کے اس لکھے کو کیونکر دھوسکتی ہے۔ بوٹوں کی کمپنیوں کی مالک تھوڑی ہے تو۔''

بات یہ بھی ٹھیک تھی۔ شاہ جہاں گلاب کے اس پھول سے گیت سنانے کو کہہ رہی تھی اور وہ بوڑھی عورت کی طرف انگشت شہادت کرتے ہوئے ہنستی تھی۔

سُنتا ہے تو اس سے سنو۔ یہ آواز زمانوں تک اپنی شیرینی سے تمہارے کانوں کو بتاتی

رہے گی کہ اس نے کوئی مارواڑی گیت سنایا تھا۔

اچھا شاہ جہاں نے آنکھیں پھاڑیں۔

معمر عورت انکساری سے کام لیتی تھی۔ جب شاہ جہاں نے زیادہ مجبور کیا۔ تب اس نے کہا۔

''دراصل ڈامن اور ڈیانگ کے بغیر گیت گانے کا صحیح لطف نہیں آتا۔''

''کمال ہے اب نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی والی بات تو نہ کرو۔''

اس نے اب ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

میندوق لیس پاری یاوے دخلاے میندوق تھورو نالیسید ے نی سروغی تیونا ستونگ سلام بید۔

جب پھول کھلتے ہیں تو نیچے سے اوپر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ میرے ساتھی میرے ساتھی میں تمہیں سلام کرتی ہوں۔

ہر مرد کا شباب تین ادوار تک ہوتا ہے۔

ہر عورت کا شباب تین بچے جننے تک ہوتا ہے۔

خوب صورت پھول بھی تین صبح تک کھلے رہتے ہیں۔

طاقتور گھوڑے بھی پولو کے تین گیم کھیل سکتے ہیں۔

تند و تیز گھوڑی بھی صرف تین ڈانوق تک دوڑ سکتی ہے (پولو کھیلتے ہوئے کھلاڑی گیند کو سٹک سے شاٹ مارتا ہے۔ وہ ڈنوق کہلاتا ہے)

گھر بار نہ ہونے کا احساس شام کو ہوتا ہے۔

اور اولاد نہ ہونے کا احساس بڑھاپے میں ہوتا ہے۔ میرے ساتھی! میرے تو میں تجھے سلام کرتی ہوں۔

یقیناً آواز نغمگی اور پختگی کے اعتبار سے بے مثال تھی۔ لیکن گیت کا جب ترجمہ شاہ

جہاں نے اسے بتایا تو وہ دنگ رہ گئی۔ اسے حیرت تھی اس جاہل اور ان پڑھ عورت کی قوت مشاہدہ اور احساس آگہی پر کہ زندگی کے مسائل اور اس کے اسرار و رموز پر اس کی سوچ کی گرفت کتنی قوی تھی کہ جو خالق تھی اس گیت کی۔

وادی کھرمنگ کی وہ حسین صورت عقل و دانائی کی مورت نیک سیرت اور اس گیت کی خالق اپنے ساتھی سے بہت پیار کرتی تھی۔ دیوانہ وار اسے چاہتی تھی۔ پر اس کا ساتھی یعنی تو بڑا ہرجائی تھا۔ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا تھا۔ دنوں گھر اور اس کی صورت نہیں دیکھتا تھا۔ وہ صبح سویرے دہلیز میں بیٹھ کر اس کی راہ دیکھتی رہتی اور شام کو مایوسیوں میں گھری اپنے کمرے میں آ بیٹھتی اس کا اندر دکھ اور بے چارگی کی آگ میں جلتا رہتا۔ تب ایک دن وہ کرب اس کے ہونٹوں پر اس گیت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جو ہر اس کا دل کا ترجمان بنا جو کسی نہ کسی واسطے اور وسیلے سے مرد کی بے وفائی کا شکار ہے۔

وہ دونوں دوپہر تک ان کے ساتھ رہیں۔ کھانا کھا کر رخصت ہوئیں۔

شاہ جہاں اور اس نے بھی واپسی کا سوچا۔ مگر گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ڈرائیور سے کھرمنگ خاص چلنے کا کہا۔

پھر اس کی طرف رخ پھیر کر بولی۔

''میں تمہیں موئے مبارک دکھانے لے جا رہی ہوں۔ تم وہاں جو دعا مانگو گی اسے قبولیت حاصل ہوگی۔''

''شاہ جہاں میں نے دعائیں مانگنی چھوڑ دی ہیں۔ میں طلب یا یافت کی کشش ثقل سے کلی طور پر آزاد ہو کر بس خلاؤں میں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔''

شاہ جہاں نے شاکی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

''مجھے اس بات کا قلبی دکھ ہے کہ تم نے اپنا آپ میرے اوپر نہیں کھولا۔''

اور اس کے جواب دینے سے پیشتر جیپ نے جھٹکا کھایا۔ قدرے ڈھلان میں اتری

اور کھڑی ہوگئی۔

کھر منگ بیامہ میں دریا کے کنارے ایک اونچی پہاڑی پر ایک دو منزلہ محل موجود ہے۔ یہ بوتی کھر کہلاتا ہے۔ اس محل کے نیچے انثوک کھر کے نام سے ایک اور محل تھا۔ یہ ماضی میں کھر منگ کے حکمران خاندان کا رہائشی محل تھا۔ انثوک کھر اور سومہ کھر کھنڈر بنے پڑے ہیں۔ بوتی کھر نہایت بوسید حالت میں موجود ہے۔

اب شاہ جہاں بضد تھی کہ چلو بوتی کھر کے ساتھ جو مسجد ہے۔ اس کی زیارت کرلو۔ وہیں موئے مبارک معصومین علیہم السلام میں سے کسی کا ہے۔

اور وہ وہاں کھڑی دریائے سندھ کے پانیوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہتی تھی۔

''چائے کا ایک کپ پینے کے بعد۔''

اب دونوں نے کمر ہمت باندھی۔ بچے نوکروں کے سپرد کئے۔ چڑھائی اتنی دشوار نہیں تھی یا پھر وہ اب عادی ہوگئی تھی۔ صدیوں پہلے کا تعمیر کردہ بوتی کھر جسے والئی لداخ نے بنایا تھا۔ اب زبان حال سے دنیا کی بے ثباتی کی کہانی سناتا تھا۔ اس قلعے کے دو حصے ہیں۔ اسی پہاڑی پر دو مسجد بھی ہے جو اب شکستہ اور بوسیدہ ہے۔ کمرے میں داخل ہوئیں تو خوف سا محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے پتھروں اور غاروں کے زمانے میں دھکیل دی گئی ہوں۔

اس نے اوپر سے نیچے دیکھا۔ کھر منگ خاص کا علاقہ اور دریائے سندھ نیچے بکھرا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں لکڑی کا ایک ٹوٹا پھوٹا صندوق تھا۔ اس صندوق میں ایک سربمہر تھیلے میں چاندی کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ ہے۔ تھیلا پھٹا ہوا ہے صندوقچے پر تالا لگا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ اسی صندوقچے میں موئے مبارک موجود ہے۔ جسے شیر شاہ کے دور میں کشمیر سے ایک فقیر ساتھ لایا تھا۔ پہلے اسے سومہ کھر کی زیارت گاہ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے انہدام کے بعد اسے مسجد میں رکھ دیا گیا ہے۔

اور جب وہ وہاں بیٹھی تھیلے اور صندوقچے کو دیکھتی تھی اسے کیپٹن ڈائل کی جاسوسی

کہانیاں یاد آئی تھیں۔ وہ کہانی بھی دماغ کے کسی کونے کھدرے سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔ جس میں ایسے ہی پراسرار سے صندوق اور تھیلے ہوتے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ تالہ توڑ کر اندر دیکھے۔ موئے مبارک کیسا ہے۔ لیکن وہ ڈرتی تھی۔

شاہ جہاں نے بتایا تھا قلعوں کی ساری نفیس کا مدار لکڑی رابعہ کے بیٹے اتار کر لے گئے تھے۔ یہ بھی لے جاتے لیکن یہ مشہور ہو گیا تھا کہ جو اس صندوقچے کو اٹھائے گا، وہ اندھا ہو جائے گا۔

وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ شاہ جہاں ہنستے ہوئے بولی۔

''ارے تم گھبرا گئی ہو بلاوجہ۔''

''بس اب چلو۔ زیارت ہو گئی ہے۔''



اُسے آمادہ کرنے کے سلسلے میں شاہ جہاں کی ہر کاوش ناکام ہوگئی تھی۔سو اصرار اور ایک پکا انکار والا معاملہ تھا۔شاہ جہاں نے جھنجھلا کر کہا۔

''قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے اس جوڑے کے لئے آخر تم اتنا کیوں گھلی جاتی ہو؟ تنہائیاں ان کا مقدر ہیں۔تم کب تک ہنگاموں سے انہیں بہلاؤ گی۔نوروز میں کے دن باقی ہیں۔صرف پانچ اور تم راہوں میں خجل خوار ہوگی۔''

''میرے خوار ہونے کو چھوڑو۔میں یہاں مضطرب رہوں گی۔بس تو یہ سمجھ لو کہ جیسے تمہیں کبھی اپنی ماں اور باپ کے لئے ہڑک اٹھی ہو، تو اسی کیفیت سے میں دو چار ہوں۔آج میں طولتی کے بازار سے کچھ چیزیں خریدنا چاہتی ہوں اور کل صبح روانگی کا قصد رکھتی ہوں۔''

طولتی کا بس چھوٹا سا بازار تھا۔سکینہ اور غلام حیدر کے لئے جب اس نے کپڑے خریدے تو اسے اپنا لاہور اور انارکلی یاد آئے۔''اے کاش میں ان کے لئے یہ چیزیں وہاں سے خریدتی۔خوبصورت اور بہترین سی۔'' اس نے اپنے جی میں کہا۔گھریلو استعمال کی کئی چھوٹی موٹی اشیاء کی بھی خریداری ہوئی۔شام ڈھل گئی تھی جب وہ محل واپس آئیں۔چھور بٹ کے لئے رات جیپ والے سے بات ہوگئی تھی۔شاہ جہاں نے کھانے پینے کی سب اشیاء ایک تھیلے میں ڈال دی تھیں۔چائے کی بوتل بھی بھر دی تھی۔

واپسی کا یہ سفر اسے بہت لمبا اور بوجھل محسوس ہوا۔بس سکینہ اور غلام حیدر سے ملنے کی امنگ شریانوں میں دوڑتے خون کو بہت تیز کر دیتی۔وہ چشم تصور سے ان لمحوں کا سوچتے ہوئے

خود ہی مسکرا دیتی۔

اس وقت شام ڈھل گئی تھی جب وہ سکسہ کے محلے یگ چھد کی جامع مسجد کے سامنے اتری۔ ساڑھے چار ماہ پیشتر جب وہ یہاں آئی تھی اس وقت وہ ہواؤں میں اڑتے پھرتے تنکے کی مانند تھی۔ لیکن آج وہ جانتی تھی کہ ایک ایسا گھر بھی ہے جہاں وہ دو جانیں اسے یاد کرتی ہوں گی۔ اس کی آمد کی منتظر ہوں گی۔ ایک دوسرے سے کہتی ہوں گی کہ ”ارے اس سیلانی کا کیا پتہ کھر منگ سے کہیں آگے نہ نکل جائے۔“

یقیناً وہ اپنا سینہ چیر کر انہیں نہیں دکھا سکتی تھی۔ کہ وہ شاہ جہاں جیسی مخلص اور چاہنے والی دوست کے سارے جذبات پیروں تلے بے دردی سے روند کر صرف اس لئے آئی تھی کہ نوروز کے ہنگاموں میں کربناک خیال کا یہ سنپولیا اسے ڈس ڈس کر اژدھا ہوا کر ڈالتا کہ وہ تنہا ہیں۔

جیپ کے رکتے ہی جب بچوں نے اسے اترتے دیکھا تو خوشی سے بھاگے اور اس کے اردگرد آ کھڑے ہوئے بیشتر بچوں کو وہ پہچانتی تھی۔ کچھ اس کے پاس پڑھنے بھی آتے تھے۔ اس نے ان سب کو پیار کیا۔ سامان انہیں پکڑایا اور گھر کی طرف قدم اٹھائے۔

سکینہ کمرے میں چولہے کے آگے بیٹھی ہنڈیا پکاتی تھی۔

”تی تی آمو دیکھو میں آ گئی ہوں۔“

سکینہ کا حال کچھ ایسا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہو، لیکن جب وہ اس کے گلے سے، اس کی چھاتی سے چمٹی، تب وہ گلوگیر آواز میں اس کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔

”مجھے یہ خواب لگتا ہے میری بچی تم واپس آ گئی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”تمہارے بغیر نوروز کے تہوار کا بھلا آمو کیا لطف آتا۔“

غلام حیدر کے جذبات بھی سکینہ سے کچھ مختلف نہ تھے۔ رات کو وہ دونوں کے پاس بیٹھی ہنستی تھی۔

''اچھا تو، آپ سمجھتے تھے کہ اب میں بس گئی۔'' پھر دفعتاً اس نے سر جھکایا۔ اس کی آنکھوں کے اندر کا درد چھلک پڑا تھا۔ وہ بولی۔

''آتا اور آ مو! میں نے اب کہاں جانا ہے۔ کہیں گئی بھی تو لوٹ آنے کے لئے جاؤں گی کہ یہ میرا گھر ہے۔ اور یہاں میرا باپ اور ماں ہے۔''

وہ دونوں بھی رو دیئے تھے۔ سکینہ اٹھ کر انڈوں کی ٹوکری اٹھا لائی۔ مختلف رنگوں کی پڑیا ٹوکری میں سے نکال کر اسے دکھاتے ہوئے بولی۔

''غلام حیدر ایک ہفتہ ہوا یہ سب لے آیا تھا۔ نوروز آنے والا ہے نا ہم کہتے تھے وہ آئے گی تو انڈوں پر خود ڈیزائن بنائے گی۔

اس نے وہ سب چیزیں جو وہ ان کے لیئے لائی تھی، انہیں دکھائیں وہ خوش بھی ہوئے اور ناراض بھی کہ بلاوجہ اس نے اتنا خرچ کیا۔

دادی جواری کے لئے وہ چادر لائی تھی۔ زینب کے لئے چوڑیاں۔ ''اب انہیں تو صبح ہی یہ دینے جاؤں گی۔'' اس نے سوچا اور عشاء کی نماز کے لئے اٹھ گئی۔

ابھی اس کی نماز ادھوری ہی تھی، جب بڑے لڑکوں کا ٹولہ جو اس سے پڑھتا تھا، اندر آیا یہ لوگ پولو گراؤنڈ میں گنگ پولو کھیلتے تھے۔ جب انہیں خبر ملی کھیل کو یونہی چھوڑ کر بھاگنے لگے جب ایک نے کہا۔

''ذرا رکو۔ اطمینان سے چلتے ہیں۔'' تب سب اپنے اپنے گھروں میں گئے۔ کھانا وانا کھا کر اب آئے تھے۔

بہت دیر تک وہ ان سب سے باتیں کرتی رہی۔ نوروز کے لئے ان کے پروگرام سنتی رہی پھر سکینہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اب اسے سونے دو صبح کی تھکی ہوئی ہے کل غدار کھے پھر آنا۔''

نوروز کی عید ایرانیوں کے نئے سال کے پہلے دن منائی جاتی ہے۔ شمالی علاقوں

خصوصی طور پر بلتستان پر ایرانی تہذیب کا گہرا اثر ہے۔

صبح ہوئی اور گھر میں ہنگامے جاگ اٹھے۔ موسم گو ابھی بھی بہت سرد تھا۔ منفی سنٹی گریڈ کے مختلف درجات کا چھوٹا نقطہ انجماد پر آ کر اب کچھ رک گیا تھا۔ لیکن جوان خون درجہ حرارت کے اس اُتار چڑھاؤ کو ذرا برابر خاطر میں نہ لاتا تھا۔

ابھی وہ بمشکل ناشتے سے فارغ ہوئی تھی جب دادی جواری کے پوتے پوتیاں اپنے نئے کپڑوں کی پوٹلیاں اٹھائے کمرے میں آ موجود ہوئے۔

''ارے واہ'' اس نے ایک ایک کے کپڑے کھولے اور دیکھے۔ با آواز بلند واہ واہ کے نعرے لگائے۔ سرخ پھٹے ہوئے رخساروں والے بچے اس کی واہ واہ پر پھول کی طرح کھلے جاتے تھے۔

جب دھوپ اپنے جوبن پر آئی۔ وہ سب کے ساتھ اس کھلے میدان میں آ گئی۔ جو گھروں کے سامنے تھا۔ مارچ کے تیسرے ہفتے کی نرم گرم میٹھی دھوپ جو سردی کی شدت سے سوئے ہوئے اعضاء کے لئے ٹکور کا کام دیتی تھی۔

زینب اور رضا عباس کی من موہنی سی بہن دولت بی بی بھی اپنے انڈوں کی ٹوکریاں اٹھا لائیں۔ تازہ تازہ ابلے انڈوں کو انہوں نے ٹھنڈا ہونے دیا۔ زینب اور دولت نے مختلف پیالوں میں مختلف رنگ کھولے۔ اب ان انڈوں پر پچی کاری کا کام شروع ہوا۔

کہف الوریٰ کو پینٹنگ سے خاص شغف تھا۔ اس نے اپنے انڈوں پر ایسے ایسے دلکش ڈیزائن بنائے کہ سب عش عش کر اٹھیں۔ سب کی خواہش تھی کہ وہ ان کے انڈوں پر بھی کچھ بنائے۔'' بھئی کیوں؟ یہ سب میں نے تم لوگوں کو عیدی دینے کے لئے تو بنائے ہیں۔ کوئی انہیں گھر تھوڑی رکھنا ہے۔''

جب دھوپ پہاڑوں کی اوٹ میں چلی گئی اور جسم ٹھنڈک سے کپکپانے لگے، تب سب اٹھیں۔ اپنی اپنی ٹوکریاں اٹھائے گھروں میں لوٹیں۔ سکینہ گھر کی جھاڑ و پونچھ میں مصروف تھی۔

اس نے دیکھا تو بولی۔

''میں نے آپ کو منع بھی کیا تھا کہ کہ اکیلے کوئی کام نہیں کرنا۔صبح سے ہلکان ہوتی رہی ہیں۔''

اور وہ مسکرائی ''ارے کب میری جان! مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جسم میں پارہ بھرا ہو۔''

کھانا کھا کر وہ دادی جواری کے ہاں گئی۔ان کی مشین پر اس نے سکینہ اور غلام حیدر کے کپڑے سیئے۔رات دیر تک وہ ان کے گھر رہی، کپڑے بھی سیئے، گپیں بھی لگائیں اور یہ بھی اپنے آپ سے کہا۔

''اپنائیت کا یہ لُطف اور سُر ور رگ رگ میں اتر کر سرشاری کا کیسا لطیف احساس دیتا ہے۔کھر منگ میں یہ مزے کہاں تھے؟''

ساری وادی میں ہنگامے انگڑائی لے کر جاگے تھے۔وادی کے نوجوان لڑکے پولو اور نشانہ بازی کے مقابلوں کی تیاری کر رہے تھے۔دریا پار کے گاؤں ''مرچھا'' کی پارٹی پولو کھیلنے کے لئے نوروز کے دن سکسہ میں آنے والی تھی۔

لڑکیاں اپنی تیاریوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔عورتیں گھروں کی لیپا پوتی اور ان کی سجاوٹ میں جتی تھیں۔ہر گھر دار خاتون نے کلچے، زرچون اور ازدق (سموسے) وغیرہ تیار کر کے رکھ لئے تھے۔مرد لوگ کھیتی باڑی کے کام میں مصروف ضرور تھے پر تقریباً سبھی ربیع کی اہم فصل جن میں گیہوں، جو، مٹر، مسور اور باقلہ شامل ہیں، کی کاشت سے فارغ ہو چکے تھے۔

بیس مارچ کی شام کو لڑکیوں کا جتھا کمرے میں بیٹھا تھا۔مہندی گھلی ہوئی تھی اور وہ ان کے ہاتھوں پر میدانی علاقوں کے دل کش ڈیزائن بنا رہی تھی۔کمرے میں شور تھا۔زینب نے گیت شروع کر دیا۔چندا اور لڑکیوں نے بھی آواز ساتھ ملائی۔

جب سے اس نے بلتی بولنی شروع کی تھی، مقامی لڑکیوں کی ہچکچاہٹ خاصی کم ہو گئی تھی

تکلف بھی ختم ہو گیا تھا۔

چھور بٹ کی وادی چھولونگ کھا کی خوبصورت دل کش لڑکی جس کا نام شرنگ زومبا تھا،
یہ اس کے جذبات واحساسات کا نمائندہ گیت تھا۔ چھولونگ کھا سے آگے لداخ کا علاقہ شروع
ہوتا ہے لداخ کے گاؤں بلیک کا ایک لڑکا شرا اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ زومبا کے والدین
نے بچپن ہی سے اس کی منگنی شرا سے کر رکھی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ زومبا بھرپور جوانی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ شرا اسے بیاہنے نہیں
آیا۔ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ لڑکی جب دلہن بنتی تو دائیں اور بائیں طرف کے بالوں کو
کان کی لوؤں کے برابر تراش دیا جاتا تھا۔ جسے بلتی زبان میں چن چن کہتے ہیں۔ سر کے باقی
اور پچھلی طرف کے بالوں کی چٹیا بنالی جاتی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ لڑکی بیاہی ہوئی ہے۔ زومبا
شرا کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے بال بڑھتے رہے حتی کہ اس کے گھٹنوں کو چھونے لگے۔ یہ
بڑھتے ہوئے بال اسے اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس دلانے لگے۔ اس نے اپنے محبوب سے
مخاطب ہو کر وہ گیت گایا جو اس وقت زینب اور لڑکیاں گا رہی تھیں۔

شرا بلیک لے یاستر قیبونی لے ستر قیا ستر ق فرو کھید ے شلما لوق

ناشرنگ زومبانوے ہر کالوبو کھمی رلوق

ترجمہ۔ بلیک والے شرا! چکورا پنے بچوں کے لئے ترائیوں کی دوسری طرف نکل گئے۔
مجھ زومبا کی زلفیں گھٹنوں سے بھی نیچے پہنچ گئیں۔

میں نہ مرجھاؤں تو اور کون مرجھائے

اپنے بچپن کے حسین ساتھی سے ملنے کا دن معلوم نہیں کب آئے گا

کب آئے گا، کب آئے گا، کب آئے گا۔

''کب آئے گا'' کی تکرار جب زیادہ بڑھی تو اس نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔
''خدا کے لئے ایسی بے صبری کا مظاہرہ مت کرو۔ ملنے کا دن بہت جلد آجائے گا۔''

ساری لڑکیاں ہنس پڑی تھیں۔ کوئی گیارہ بجے ہنگامہ ختم ہوا۔ لڑکیاں گھروں کو سدھاریں۔

اکیس مارچ کا دن اپنے جلو میں خوشیاں اور رنگینیاں لے کر طلوع ہوا۔ بچے رنگ برنگے کپڑوں میں پھولوں کی مانند نظر آتے تھے۔ جو بچہ گھر آیا، اس نے اسے رنگین انڈے کی عیدی دی۔ زینب نے پیغام بھیجا تھا کہ دوپہر کا کھانا ان کے گھر ہے۔

کھانا کھا کر اور قہوہ پی کر وہ دولت کے ساتھ باہر نکل آئی۔ پولو گراؤنڈ کے پاس لڑکے انڈوں کا کھیل کھیلتے تھے۔ چار لڑکوں کے ہاتھوں میں انڈے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کے سرے ٹکراتے۔ اس میں بڑی مہارت کا مظاہرہ ہوتا۔ بس ذرا سی خراش آئی اور انڈا دینا پڑا۔

ذرا آگے چند لڑکے اُبلے انڈوں کو ڈھلان سے لڑھکا رہے تھے۔ جس کا انڈا پہلے نیچے پہنچتا وہ بقیہ سارے انڈے جیت لیتا۔

مرکزی شغرن (پولو گراؤنڈ) میں بہت رش تھا۔ ساری وادی امنڈی پڑی تھی موسیقی زور و شور سے بجتی تھی اور لوگ پولو کھیلنے کی تیاری میں تھے۔



وہ اس آواز کو ہزار آوازوں میں سے پہچان سکتی تھی۔ اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اور کان کھڑے کئے تھے۔ اس سارے عمل میں صرف تیس سیکنڈ صرف ہوئے ہوں گے۔ پھر وہ جست لگا کر باہر کی طرف دوڑی تھی۔ غلام حیدر اور سکینہ دونوں حیرت زدہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے کہ ایکا ایکی چائے پیتے پیتے اسے ہوا کیا؟

پتھروں کے پوڈوں کے پاس سیماں کھڑی تھی۔ پیچھے زینب اور اس کا بڑا بیٹا تھے۔ کس والہانہ انداز میں وہ اسے چمٹی تھی۔ کوئی پندرہ منٹ یونہی گزر گئے۔ ہجر کے طویل دنوں کی خشک سالی جب ملاپ کے پانیوں سے کچھ سیراب ہوئی تب سیماں نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گلہ کیا۔

''خوب وعدہ وفا کیا۔''

اور اس نے ہنستے ہوئے اس کا بازو کھینچا۔

''بس شکوے شروع ہو گئے۔ آگے آؤ نا۔ تی تی آ تا غلام حیدر سے نہیں ملنا کیا؟''

سکینہ اور غلام حیدر نے اسے سینے سے لگایا۔ پھر سب وہیں چھپرے پر ہی بیٹھ گئے۔

''سیماں آج ہم نے بلے پکایا ہے۔ کھاؤ گی نا'' اس نے پیار بھری نظریں استفہامیہ انداز میں اس کی طرف اٹھاویں۔

سیماں کی جوابی مسکراہٹ کچھ یہ کہتی تھی کہ ''یہ تم گھر والی کب سے بن گئی ہو؟''

وہ پلیٹ میں بلے لے آئی۔ سیماں نے چمچ کے ساتھ کھانا شروع کیا۔ زینب سے بھی

اس نے کہا۔لیکن اس نے جواب دیا۔

''میں کھانا کھا کر آئی ہوں۔''

سیماں ان دونوں سے پوچھتی تھی کہ آخر انہوں نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے کہ اسے چھوربٹ میں ہی سریش لگ گئی ہے۔

اور جب سیماں بلے کھا کر اور چائے پی کر فارغ ہوئی، اس نے بتایا کہ وہ اس آوارہ گرد کو لینے آئی ہے۔ کیونکہ روح اللہ کے جگری یار سکندر کے بھانجے ندیم کی شادی ہے اور ان سب نے شگر جانا ہے۔

اور کہف الوریٰ کو محسوس ہوا تھا کہ ان کے چہروں کا خون پھر نچڑ گیا ہے۔ اسنے فوراً سکینہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور بولی۔

''آ مو میں شادی میں شرکت کے بعد پھر یہیں آ ؤں گی۔ آپ میرا کہیں جانے کا سن کر پریشان کیوں ہو جاتے ہیں؟''

''تیرے دم سے یہ اُجاڑ اور ویران سا گھر بولتا جو ہے۔'' سکینہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''آپ مجھے ہنتے مسکراتے بھیجا کریں اور ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ مجھے اسی گھر میں لوٹ کر آنا ہے۔''

سیماں خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی تھی۔ جب دونوں کے درمیان تنہائی ہوئی۔ اس نے پوچھا تھا۔

''یہ سب کیا چکر ہے۔ تو نے واپس نہیں جانا کیا؟''

اور اس نے چہرے پر سے اون کے ابھرے ہوئے بروں کو چنتے ہوئے جیسے سیماں سے نہیں اپنے آپ سے کہا۔

''شاید کبھی نہ جاؤں۔ میں نے تو ماضی سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ زندگی گزارنا ہے، سو گزر ہی جائے گی۔''

سیماں نے چونک کر اس کی جانب بغور دیکھا تھا۔

''تم نے کبھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ تم سیر سپاٹوں کی دلدادہ ہو اور۔۔''

اس نے سیماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم یہی سمجھتی رہو۔''

''غریت برتتی ہو۔ اپنا آپ اپنے اندر ہی رکھنا چاہتی ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔

اور اس نے سیماں کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''سیماں میری جان! کسی بھی بدگمانی کو دل میں جگہ نہیں دینا میں سب کچھ تمہیں بتاؤں گی۔ پر اس وقت جب میرا دل چاہے گا۔''

غلام حیدر کے اندر آ جانے سے دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پھر وہ اٹھی اور اس نے کہا۔

''میں اب چلتی ہوں صبح کا پروگرام ہے۔ بچے اور روح اللہ شگر پہنچ گئے ہوں گے۔ میں صرف تمہیں لینے آئی تھی اور ہاں واپسی پر تمہیں سکردو جانا ہوگا۔''

چھوربٹ سے شگر کا سفر گو بہت لمبا تھا لیکن ایک تو جیپ نئی تھی اور دوسرے ڈرائیور نہایت مستعد تھا۔ شگر خاص میں وہ کوئی چار بجے پہنچیں۔ سیماں کا خیال سفر جاری رکھنے کا تھا۔ پر اس نے زور دیا کہ نہیں، انہیں رات داؤد صاحب کے ہاں گزار لینی چاہیے۔ گلاب پور تک پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔

دراصل وہ پاشا سے ملنا چاہتی تھی۔ مسٹر و مسز داؤد اور ان کے بچوں کو دیکھنے کی متمنی تھی تھی پر سیماں اس کی بات پر فوراً بولی۔

''ارے گلاب پور شگر سے صرف سترہ میل ہے۔ جس دولہا کی شادی میں ہم شرکت کے لئے جا رہے ہیں یہ اکثر و بیشتر اپنے گھر سے پیدل شگر پڑھنے آتا تھا۔ ہم لوگ تو جیپ پر

ہیں۔ یوں بھی علی میری راہ دیکھتا ہوگا۔''

اور جب سورج ڈوب رہا تھا، وہ وزیر پور پہنچ گئی تھیں۔ وادی کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ دریائے شگر کا پاٹ بھی اب خاصا چوڑا ہو گیا تھا۔ بس اگلی وادی گلاب پور تھی۔

وزیر پور سے ایک بڑا نالہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے آتا ہوا انہوں نے دیکھا۔ ابھی اس میں پانی نہیں تھا۔ بس برف کے تودے جے نظر آتے تھے۔ گلاب پور ابھی کوئی پانچ کوس دور تھا۔ پھلدار درختوں کے سفید اور گلابی پھول فضا میں نرالا حسن بکھیرے ہوئے تھے گلاب پور کے نزدیک نالہ دریائے شگر میں گرتا تھا۔

اور جب جیپ رکی اس نے جانا کہ وہ منزل پر پہنچ چکی ہیں۔ پر اتری تو یوں محسوس ہوا جیسے دل ابھی ہڈیوں کے پنجر کو توڑتا پھوڑتا باہر آ جائے گا۔ روح اللہ اور ڈاکٹر ابراہیم دونوں کھڑے تھے۔ روح اللہ اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد سیماں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

بہت دیر لگائی تم لوگوں نے۔ ''صبح جلدی چلنا تھا۔''

''ارے جلدی تو چلے تھے۔ پر یہ راستے میلوں کو تیزی سے ہضم کرنے والے تھوڑی ہیں۔'' اس نکھیے اندھیرے میں رُوح اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہف الوریٰ کو محسوس ہوا تھا جیسے ڈاکٹر ابراہیم کی نگاہیں اُس پر جمی ہوئی ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا تھا۔

اب انہیں ندیم کے گھر ''کیا ہونگ'' محلّہ جانا تھا۔ چھوٹی چھوٹی پتھریلی گلیاں۔ روح اللہ پیچھے سے ٹارچ کی روشنی پھینکتا تھا خاصا چلنے کے بعد گھر آیا۔ لکڑی کی چھ سیڑھیاں، جنہیں چڑھ کر وہ ایک کشادہ راہداری میں آئیں۔ بجلی نہیں تھی اور گیس کے ہنڈولے جلتے تھے۔

دائیں ہاتھ نشست گاہ تھی۔ دونوں بائیں ہاتھ مڑیں۔ کمرہ کشادہ تھا۔ شیبہ سو رہی تھی۔ گھر کی عورتیں کمرے میں آ گئی تھیں۔ ان سے میل ملاپ ہوا۔ ندیم کی والدہ، سکندر کی بیوی، ماں اور دیگر رشتہ دار خواتین۔ سکندر کی بیوی ایک اونچے افسر کی بیگم ہونے کے باوجود نہایت

سادہ اور منکسر المزاج خاتون تھی۔

یہ کھور کسق کی شب تھی (عروسی تقریب کی پہلی شب) محلے کی سماجی تنظیم کے ارکان انتظامات کا جائزہ لینے کے لئے نشست گاہ میں آئے بیٹھے تھے۔ گھر کی عورتیں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اٹھ گئی تھیں کیونکہ انہیں کھانا دینا تھا۔

علی بے حد پیارا بچہ تھا۔ للی اس سے کہتی تھی کہ آنٹی آپ نے تو نیلو اور چھور بٹ میں ہی ڈیرے ڈال لئے ہیں۔ اور وہ جواباً پوچھتی تھی۔

''ارے بڑی بھابھی کیوں نہیں آئیں۔''

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر عورتیں دلہن کے گھر لے جانے کے لئے کولچہ (ایک قسم کا کھانا) پکانے کی تیاریوں میں جت گئیں۔

وہ اور سیماں بہت تھکی ہوئی تھیں بس لیٹنے کے ساتھ فوراً سو گئیں۔



نیلے شفاف اور کھلے آسمان کے نیچے دریائے شنگر کے ٹھنڈے ٹھار پانیوں پر زخ (ڈنڈوں اور مشکوں سے بنی کشتی) پر سفر کرنا گویا ایک قدیم، پراسرار اور پرامن دنیا میں سفر کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت جب سورج کی چمک ماند پڑی ہوئی تھی۔ گلاب پور کے پہاڑوں پر شام کے سائے گھنے تھے اور مقابل وادی مرتضٰی آباد پر جیسے کسی نے سونا بکھیرا ہوا تھا۔ وہ پندرہ لوگ مرتضٰی آباد کی شہزادی حسنیہ کے لئے مہندی لے کر جا رہے تھے۔ شادی کے کپڑوں (وردان) کی نوک پلک وہ سیماں اور بیگم سکندر سارا دن سنوارتی رہی تھیں۔ رواج کے مطابق پکے ہوئے کھانوں کے تخفوں (کھمی تھل) اٹھارہ کو لیے۔ ہر کو لیے کا وزن آدھ کے جی کے برابر تھا۔ چار کھب سے، ہر کھب سے کا وزن دو کے جی تھا، کی تیاری اور پیکنگ میں دولہا کی ماں بہنوں اور نانی نے بہت اہتمام سے کام لیا تھا۔

ان پندرہ لوگوں میں ڈاکٹر ابراہیم بھی تھا۔ اس کا علم اسے زخ پر بیٹھ کر ہوا تھا۔ گھر سے نکل کر جب وہ اس جگہ پہنچیں جہاں سے ڈھلائی راستے کے ذریعے اتر کر انہیں کنارے پر بندھی زخ پر بیٹھنا تھا۔ وہ حیران ہوئی تھی زخ کو دیکھ کر۔ پانچ پانچ مشکوں کی پانچ قطاریں افقی اور عمودی صورت میں بندھی تھیں۔ ان پر لکڑی کے ڈنڈوں کا جال بنا ہوا تھا۔ زخ کے چاروں سروں پر ایک ایک زخ بان بیٹھا ہوا تھا۔ دو ماہر زخ بان آگے اور دو پیچھے ہاتھوں میں لمبے لمبے ڈنڈوں کے ساتھ ان کے بیٹھنے کے منتظر تھے۔

بیٹھتے سے اس نے پوری احتیاط کی کہ اس کی نشست کسی طور پر ڈاکٹر صاحب کے پاس

نہ آئے۔ وہ تو اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئی، پر ڈاکٹر ابراہیم نے روح اللہ کے ساتھ جگہ بدل کر اسے ناکام بنادیا۔ اور جب کشتی چلی، انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کہف الوریٰ آپ کو یہ سب کیسا لگتا ہے؟''

''بہت اچھا۔ ایک پُرلطف اور دلچسپ تجربہ۔''

شاید وہ جھٹکا کھا کر کنارے پر نہ گرتی اگر رُخ کے رُکنے پر ڈاکٹر ابراہیم کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں نہ پڑتے۔

''میں آپ کو یاد کرتا تھا۔''

اُسے آج تک یاد کرنے والا تو کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ لڑ لگنے والا مہینوں دور رہنے کے بعد کبھی آ کر یہ نہیں کہتا تھا کہ تم مجھے یاد آتی تھیں یا میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔ ان سنگلاخ وادیوں میں اگر کسی نے اسے یہ کہا تھا تو بھلا وہ رُخ کے ڈنڈے سے الجھ کر کنارے پر کیسے نہ گرتی۔ جب ذہن میں گڑ بڑ ہو جائے تو توازن برقرار رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

سیماں، روح اللہ، ڈاکٹر ابراہیم، بیگم سکندر سب تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے۔ وہ خجل سی ہوئی۔ فی الفور اٹھتے ہوئے بولی۔

''ارے بس یونہی ذرا سا پیر پھسل گیا تھا۔''

مرتضیٰ آباد چھوٹا سا گاؤں ہے۔ لڑکی کا گھر گاؤں کے شروع میں تھا۔ عام بلتی گھر عورتوں کو ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ مردنشست گاہ میں چلے گئے گھر کی مالی حالت اس درجہ مستحکم نظر نہیں آتی تھی جتنی دولہا کے گھر والوں کی تھی۔ لیکن رشتہ ہونے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو پرانی قرابت داری تھی اور دوسرے دلہن بہت حسین ہونے کے علاوہ ندیم کی پسند بھی تھی۔ چائے سے فراغت کے بعد وردان اور کھڑی تھل انہیں دیئے گئے۔

کمرے میں دلہن کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے تھے۔ دلہن کا ماموں آیا جس نے سب کے سامنے انہیں کھولا۔ عروسی جوڑا دیکھنے کے لئے عورتیں ایک دوسری پر گرنے لگیں۔ یہ جوڑا

شہر لاہور کی سوغات تھا۔ ندیم نے سارا مال اور انارکلی اس کے انتخاب کے لئے چھان ماری تھی۔ کوئی پندرہ سال پہلے سفید کپڑوں کا رواج تھا۔ لٹھے کے سفید کپڑے لیکن اب لڑکیاں سرخ جوڑے پہننے لگی تھیں۔ ندیم بہت دل کش رنگ چن کر لایا تھا۔

اب اس نے کھوئی تھل کا ٹوکرہ کھولا۔ کولچوں کے ٹکڑے کئے اور ایک ایک ٹکڑا سب میں بانٹا۔ جس کو اس کا ٹکڑا ملا، اس کی مسرت دیدنی تھی۔ بیگم سکندر نے بتایا کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ اگلی شام دلہن کے ساتھ بارات میں جائے گا۔

عام شادیوں کے برعکس کھانے کی ابتداء مرزن سے نہیں ہوئی سفید اُبلے ہوئے چاول پالک گوشت، سادہ گوشت، سینیوں میں چار چار پانچ پانچ ڈھیریاں وہ سیماں اور اس کے بچے ایک سینی کے گرد بیٹھ گئے عورتوں نے آفتابوں سے ہاتھ دھلائے۔

کھانے کے بعد قہوہ کا دور چلا۔ اسے دلہن کو دیکھنے کی جلدی تھی۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آئی۔ واقعی وہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھی۔ وہ بیٹھی اس سے باتیں کرتی تھی جب سیماں نے آواز دی کہ چلو دیر ہو رہی ہے۔ سلیفن گو (باراتیوں کے کھانے میں ڈالے جانے والے مکھن کو پگھلانے والے لوگ) جلدی جلدی کا شور مچاتے ہیں۔

اور باہر نکلتے نکلتے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''ان میلے کچیلے کپڑوں میں یہ لشکارے مار رہی ہے۔ بن سنور کر کیا ستم ڈھائے گی۔ ندیم بے چارہ تو غش کھا کر گر ے گا۔''

گاؤں کی لڑکیاں مہندی گھول رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا وہ تھوڑی دیر رک کر اس کے سفید مخروطی ہاتھوں پر کوئی دل کش سا ڈیزائن بنا دے۔ پر سیماں نے شور مچا رکھا تھا۔

گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں راستہ کچھ اتنا دشوار نہیں رہا تھا۔ مگر باہر اس کے مقدر جیسا گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں آسمان کے ستارے کسی خوش نصیب کے بخت جیسے تابناک تھے۔

ڈاکٹر ابراہیم سکندر اور روح اللہ کے ساتھ آگے آگے چلتا تھا اور باتیں کیے جاتا تھا۔

یہ بوجھل سی آواز جیسے بار بار اسے کہتی تھی "میں تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔"

اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ زخ میں بیٹھنے سے قبل جب سیماں کو روح اللہ پکڑ رہا تھا اور مسز سکندر اپنے میاں کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس افراتفری میں ڈاکٹر ابراہیم کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو وہ جھٹک نہ سکی۔ اسے یہ ہاتھ تھامنا پڑا۔ اسے بیٹھنا بھی ان کے پاس پڑا تھا۔ اور وہ ان ہاتھوں کو بھی نہ جھٹک سکی تھی کہ جب انہوں نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے شانوں پر ڈالا تھا۔

رات کے سناٹے میں زخ بانوں کے ڈنڈے پانی میں شڑاپ شڑاپ کی آوازیں پیدا کرتے تھے۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ کیونکر اس کوٹ کو اٹھا کر شگر کے پانیوں میں پھینک دے۔ بھلا روح اللہ اور دیگر لوگ کیا سوچیں گے۔ لیکن انہیں تو کچھ سوچنے کی قطعی فرصت نہ تھی کیونکہ وہ ان چاروں آدمیوں سے باتیں کر رہے تھے جو دلہن کے رشتے دار تھے۔ اور ان کے ساتھ جا رہے تھے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے اس مکھن کو پگھلوایا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور جسے دوسری شام براتیوں کے کھانے میں ڈالا جانے والا تھا۔ یہ رسم مار بجوس کہلاتی تھی۔

مہندی تیار تھی۔ سیماں ندیم کو کھینچ لائی۔ ندیم کے چند منچلے دوست بھی اندر آ گئے تھے۔ گورنمنٹ کالج کا ایم۔ اے پاس ندیم مہندی لگوانے سے یکسر منکر تھا۔

"ارے چلو سیدھی طرح بیٹھو ورنہ ایک دھموکا دوں گی کمر میں۔ کوئی روز روز ہم تھوڑی تیرے مہندی لگانے آئیں گے۔"

کمرے میں گیت شروع ہو گئے تھے۔ دو عورتوں نے رقص شروع کر دیا تھا۔ تالیوں کا شور ندیم کی نانی بل تھوؤ (اونی سہرا) بھی اٹھا لائی تھی۔ جسے وہ آج سارا دن بناتی رہی تھیں۔ یہ بہت خوب صورت سہرا تھا پر ندیم اعلان کیے بیٹھا تھا کہ وہ ہرگز سہرا نہیں باندھے گا۔ ناچ

گانے کی آوازیں جب ذرا بلند ہوئیں اوران کا شور کمرے سے باہر نکلنے لگا۔تب ندیم کی والدہ نے اندر آ کر کہا۔

''آوازوں کوذرا دھیما رکھو۔''

مسز سکندر بتا رہی تھیں کہ ناچ گانا معاشرے میں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

صبح ہوئی۔ ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔لیکن اس کے لیے یہ بات نہایت تعجب خیز تھی کہ بارات دولہا لے کر نہیں جاتا بلکہ دلہن لے کر آتی ہے۔ناشتے سے فراغت ہوئی تو ہر تہ سیر کی تیاری شروع ہوگئی۔

باہر سوسوا سو گھوڑے اوران کے سوار دولہا کو آس پاس کی بستیوں کی سیر کروانے کے لئے آ گئے تھے۔ندیم، دولہا بن کر شہزادہ ولگتا تھا اور جب وہ گھوڑ سواروں کے جلو میں روانہ ہوا تو مغل شہزادہ نظر آنے لگا۔

گھر کے داہنی ہاتھ کھلا میدان تھا، جہاں شامیانے تنے ہوئے تھے اور دیگیں چڑھی تھیں۔

کوئی تین بجے کے قریب مسز داؤد اور پاشا اپنے اپنے بچوں سمیت آ گئیں۔وہ دونوں سے ملی اور خوش بھی ہوئی کہ چلو اس کی دید کی تمنا تو پوری ہوئی۔

شام ہوتے ہوتے گھر عورتوں سے بھر گیا۔بلتی لباس صرف معمر عورتوں کے بدن پر تھا۔نوجوان لڑکیاں اور عورتیں خوب صورت جاپانی کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔انکے گلوں میں فلا چمکتے تھے۔ناکوں میں چہار گل لشکارے مارتے تھے اور پیشانیوں پر طومار کے جلوے تھے۔

بیگم سکندر کے کہنے پر سب عورتیں شامیانے میں آ گئیں۔یہاں قالین بچھے تھے۔اور قناتوں کے شوخ رنگ قالینوں کے شوخ رنگوں سے مل کر روشنیوں میں زندگی اوراس کی مسرتوں کا بھر پور احساس دلاتے تھے۔

اس کا جی چاہتا تھا وہ مرتضیٰ آباد جائے اور دلہن کی رخصتی کا منظر دیکھے۔شاید یہ قبولیت

کا وقت تھا۔ ندیم کی خالو اور خالہ وہاں جا رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہولی جب وہاں پہنچی، اس وقت ''چلا ہو'' کی دردناک دھن بج رہی تھی۔ دلہن اپنے ماموں کی پیٹھ پر سوار ہوگئی تھی۔ تقریباً سو آدمیوں پر مشتمل یہ قافلہ بس روانہ ہونے کو تھا۔ اندر باہر ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ رونے کا عمل تیزی سے جاری تھا۔

اور جب سورج ڈوب رہا تھا۔ بارات رخصت ہوئی۔ تمام لوگ ہفت بند (ایک قصیدہ) پڑھتے ہوئے آگے پیچھے چلنے لگے۔ جب زخ گلاب پور کے کناروں سے ٹکرائی ہفت بند پڑھنے والوں کی آوازیں خاموش فضا کا سینہ بے دردی سے چھلنی کر رہی تھیں۔ ندیم کے ساتھی اور عزیز ہاتھوں میں جلتی شکیائیں لئے کھڑے تھے۔ دلہن ماموں کی کمر پر پھر سوار ہوئی اور ندیم کے گھر پہنچی۔ دہلیز پر ندیم کی ماں سیاہ بکرا ہاتھوں میں تھامے کھڑی تھی۔ دلہن نے اسے ہاتھ لگایا اور اس وقت حلال ہوا۔ اس کا خون دہلیز کو نہلاتا ہوا نیچے بہنے لگا۔ اس سرخ ندی کو ناپ کر دلہن اندر آئی۔ کسی نے اس کا گھونگٹ نہیں اٹھایا۔ چائے اور کولچہ لایا گیا۔ اس نے وہ کھایا تب گھونگٹ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا گیا۔

دو گھروں کا مہمان بھوکا والی بات اس کے ساتھ ہوئی تھی۔ جب وہ یہاں سے چلی تھی تب یہاں کھانا ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اور جب وہاں پہنچی کھانے کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا اور چل چلاؤ کا سما تھا۔ اب بھوک زوروں پر تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی اور ندیم کی بہن سے کھانے کے لئے کہا۔

طباق دان میں کھانا آ گیا۔ سفید ابلے ہوئے چاول، پالک، سیخ کباب، یخنی اور بوٹیاں اگلے دن صبح سویرے رشتہ داروں اور میل ملاپ والے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جو آتا اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں مٹھائی یا آزوق ہوتا وہ اسے دلہن اور دولہا کے آگے رکھتے۔ بعض لوگ پکے ہوئے کھانوں کا تحفہ لے کر آئے۔

ندیم ان رسموں سے بہت گھبرایا ہوا تھا۔ پڑھا لکھا نئی روشنی اور نئی تہذیب کا دلدادہ،

غریب کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیسے اپنی جان چھڑا کر بھاگ جائے۔

سنو اس نے اپنی من موہنی دلہن کو مخاطب کیا۔

یہ مٹھائی اور چیزیں جو اکٹھی ہوتی ہیں تمہارا جی چاہے تو سب اپنے ساتھ لے جانا۔ کیا بے ہودہ رسم ہے۔ لڑکی والے اپنا لایا ہوا لے جائیں اور لڑکے والے اپنے عزیزوں کے لائے ہوئے تحفے رکھ لیں۔

سیماں اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

اگلے دن وہ اور سیماں دریائے شگر کی اس جگہ گئیں جہاں سونا پایا جاتا ہے۔ دریا کے کناروں پر ان لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں جو سونا نکالنے کا کام کرتے ہیں۔ خانہ بدوش لوگ جو یہ علم رکھتے ہیں کہ وہ کون سی جگہیں ہیں، جہاں سے سونا ملنے کی امید ہے۔ ویسے ان دریاؤں میں سونے کے ٹھیک ماخذ ابھی تک دریافت نہیں ہوئے۔



اس نے تڑپ کر سیماں کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور گلوگیر لہجے میں بولی۔

''خدا کے لئے ایسا کبھی مت سوچنا۔''

''آخر کیوں؟ کیا کنوار کوٹھا چھتوں گی۔''

وہ ان دنوں سکردو آئی ہوئی تھی۔ سیماں نے ڈاکٹر ابراہیم کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے کہا تھا۔

''میں چاہتی ہوں ڈاکٹر ابراہیم سے تیرا دائمی ناطہ جڑ جائے۔''

اور جب سیماں بضد ہوئی تب اس نے پہلی بار اسے وہ سب کچھ بتایا جو وہ اپنے اندر دبائے بیٹھی تھی۔

سیماں پھر چیخی۔

''تو اب مسئلہ کیا ہے؟''

''اتنی ظالم نہ بنو۔ سیماں میرے زخم ابھی کچے ہیں۔ ان پر وہ کھرنڈ نہیں آئے جو زخموں کی صحت یابی کی علامت ہوتے ہیں۔''

بات لٹی اور بڑی بھابھی کے کمرے میں آ جانے سے ختم ہوگئی۔

دوپہر کی ڈاک سے غلام حیدر کا خط آیا۔ شگر میں ہی وہ انہیں بذریعہ خط اطلاع دے بیٹھی تھی کہ وہ گھبرائیں مت۔ اس نے چند دن سکردو سیماں کے پاس ٹھہرنا ہے۔ آج ان کا خط آیا تھا کہ وہ چھور بٹ مت آئے۔ وہ دونوں سکردو آ رہے ہیں۔ پھر روندو جانا ہے۔ غلام حیدر

کی حقیقی چچی وادی رروند کے ایک گاؤں برق میں رہتی تھی۔ اور شدید بیمار تھی۔

"چلو یہ اچھا ہوا" اس نے اپنے آپ سے کہا اور سیماں کو بتانے کے لئے کمرے سے نکلی۔

وہ باورچی خانے کے باہر جاپانی گڑیا جیسی شیبہ پر انگریزی میں برس رہی تھی۔ شیبہ کے ہاتھ مٹی میں سنے ہوئے تھے۔

"خدا کے لئے سیماں! ان بے چاروں کی زندگی کو مختلف زبانوں کے بوجھ سے عذاب تو نہ بناؤ۔ تمہارا جب پیار بھرا موڈ ہوگا تو فارسی میں اس پر ممتا کے خزانے لٹاتی ہو۔ قہر برسانا ہوتو انگریزی کو پکڑ لیتی ہو۔ میاں کے پاس بیٹھ کر ان سے بلتی میں گفت وشنید کرتی ہو۔ میرے جیسی کے سامنے اردو کا اظہار بنا لیتی ہو۔ فار گوڈ سیک سیماں! ان مظلوموں کو اپنی علیت اور زباں دانی کی چھری سے ذبح مت کرو۔"

شیبہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ مٹی میں لتی پتی شیبہ کو اس نے گود میں اٹھایا اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"میرے سامنے اسے مت کچھ کہا کرو۔ تم سے سنبھالی نہیں جاتی تو دے دو مجھے۔

یہ مدھ بھرے دن تھے۔ ڈال ڈال پات پات مسکراتی تھی۔ درخت پھولوں اور پھلوں کی ڈوڈیوں سے سجے ہوئے تھے۔ توت میں سفید آتی جارہی تھی جو اس بات کا اعلان تھی کہ وہ پکنے میں ایک ماہ سے زیادہ وقت نہیں لیں گے۔

انتظار کے ان دنوں میں ایک دن ڈاکٹر ابراہیم آ گئے۔ وہ سکردو اسپتال میں چند مریضوں کے اہم اپریشنز کے سلسلے میں آئے تھے۔ انہوں نے سیماں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اب سیماں اس کے سر پر کھڑی کہتی تھی کہ چلو نشست گاہ میں اور وہ خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہتی تھی۔

"میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ تمہارے گھر میں بیٹھی ہوں مجبور مت کرو۔"

سیماں نے ان سے جا کر کیا کہا، یہ نہ وہ جانتی تھی اور نہ اس نے جاننے کی ضرورت محسوس کی۔ اس وقت بڑی بھابھی کا چھوٹا بیٹا اپنا معاشرتی علوم کا سبق یاد کرتا ہوا اندر آیا۔ اس کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔

''سکردو اراندو روڈ پکی سڑک سکردو سے براستہ کچورہ کواردو اور دریائے شگر کے ساتھ ساتھ ارندو گاؤں تک جاتی ہے۔ اس سڑک کی لمبائی ۱۴۵ کلو میٹر ہے۔''

سڑک کچی ہو یا پکی وہ کہیں نہ کہیں ضرور پہنچتی ہے۔ وہ اب سوچوں میں گھری بیٹھی تھی۔ پر جس کچی پر خطر سڑک پر میں چل رہی ہوں، اس کی کوئی منزل نہیں۔ یہ کہیں نہیں پہنچے گی۔ یوں ہی بھول بھلیوں میں الجھا کر مجھے پریشان کرتی رہے گی۔

اور جب شام گہری ہو رہی تھی، وہ دونوں آ گئے تھے۔ اس نے سکھ کا لمبا سانس بھر کر اپنے آپ سے کہا تھا۔

''چلو شکر ہے، نئی جگہ نئے حالات اور ان دو محبت کرنے والوں کی موجودگی میں ذہن کو سوچ و بچار میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔

رات وہ لوگ ٹھہرے۔ صبح جب وہ چلنے کے لئے تیار ہو رہی تھیں، سیماں اس کے پاس آئی تھی۔ وہ کچھ ناراض معلوم ہوتی تھی کچھ تلخی سی جھلکتی تھی اس کی آواز میں، وہ کہہ رہی تھی۔

''بھلا یوں کب تک یہاں وہاں بھٹکتی رہو گی۔ گھر بساؤ ایک جگہ ٹک کر بیٹھو۔''

صبح صبح سیماں کا یہ لیکچر اسے سخت ناگوار گزرا۔

''گھر کیا بسایا نہیں تھا پر جب اوپر والے کو میرا اس میں ٹک کر بیٹھنا پسند نہیں تھا تو بھلا میں کیا کرتی۔ بقیہ جہاں جہاں کا آب و دانہ چگنا ہے، وہ انسان اپنی خواہش کے برعکس بھی کھانے پر مجبور ہے۔''

وہ کوئی نو بجے بسوں کے اڈے پر پہنچے نیٹکو والوں کی ایک بس صبح سویرے گلگت کے

لئے نکل چکی تھی۔ ماشہ بروم والوں کی بس تیار تھی۔ چند سواریوں کی بس کی تھی۔ غلام حید ماشہ بروم میں سفر کرنا پسند نہیں کرتا تھا، پر اب مجبوری تھی۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد بس چل پڑی۔ ان کا یہ سفر سکردو گلگت روڈ پر شروع ہوا۔ ۲۲۴ کلو میٹر لمبی اس سڑک کا بیشتر حصہ پختہ بن چکا ہے۔ بقیہ کا پکا کرنے کا کام تیزی سے جاری ہے۔

سکردو کے بالمقابل کوارو کے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے غلام حیدر نے کہا۔

''ان پہاڑوں میں بہترین اور اعلیٰ قسم کے سنگ مرمر کی کانیں ہیں۔ راجگان نے ماضی میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ لیکن اب ان کانوں سے کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ یہ کانیں باشہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔''

''کیوں کام نہیں لیا جا رہا ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

بس تیزی سے کولتار کی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اب دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سفر طے ہو رہا تھا۔ غلام حیدر اسے بتا رہا تھا۔

وادی روندو کا مقامی اور قدیم نام رونگ یل ہے۔ یہ وادی دریائے سندھ کے دونوں پہلوؤں پر واقع ہے۔ یہ ڈھری پڑی سے شروع ہو کر حراموش تک پھیلی ہوئی ہے تحریک آزادی کی پہلی جھڑپ اسی مقام ڈھری پڑی پر ہوئی تھی۔ پوری وادی قراقرم اور ہمالیہ کے درمیان واقع ہے۔

اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ تھوڑا سا شیشہ کھولا ہوا فراٹے بھرتی اندر آنے لگی۔ اس نے شیشہ بند کر کے سر اس سے ٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔

ڈاکٹر ابراہیم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ زبیر بھی آ گیا تھا۔ وہ مارگزیدہ تھی۔ تہی دامن تھی۔ اسے اپنے بنجر ہونے کا شدید احساس تھا۔ وہ ایک بار پھر اس دوزخ میں گرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی جہاں مرد عورت سے اپنی بقا کا طلب گار رہتا ہے۔

پیر گنگ غلچو کے بالمقابل وادی چھری ہے۔ چھری کے بارے میں غلام حیدر نے بتانا

شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ بس ایک سوال اسے بے چین کرنے لگا تھا۔

''کیا واقعی وہ اتنی بدنصیب ہے کہ سکون جیسی دولت کو ہمیشہ ترستی رہے گی۔

بشو کی وادی گزر گئی۔ یہاں کے انگوروں کی لذت کے بارے میں اس نے بہت کچھ سنا تھا لیکن انہیں آزمانے کا ابھی تک موقع نہیں ملا تھا۔ بشو سے پل کے ذریعے دریا پار ہوا۔ تو تو نگوس اور باغیچہ گزرے۔

طور میک میں پہنچ کر بس رک گئی اور وہ لوگ اتر گئے۔ یہ پہلا ایسا سفر تھا جس میں اس نے سارا راستہ سوچنے اور آنکھیں بند کرنے میں گزار دیا تھا۔

سکینہ نے کوئی دس بار پوچھا ہوگا کہ وہ کیوں آنکھیں بند کئے ہوئے ہے۔ کیوں باہر نہیں دیکھتی۔ اس کی طبیعت تو خراب نہیں۔

''ارے نہیں آمو آپ تو بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں۔'' وادی طور میک کی ایک جھلک اسے یہ بتانے کو کافی تھی کہ یہ انتہائی خوب صورت، نہایت گنجان آباد اور میووں کی دولت سے مالا مال وادی ہے۔



یہ انکشاف کس قدر تعجب خیز، کتنا انوکھا اور نرالا تھا کہ بھیڑ بکریوں اور گائے بھینسوں کی طرح بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر گلیشیئر بھی باقاعدہ پالے جاتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال پالتو جانوروں کی طرح ہی کی جاتی ہے۔ وہ تو پہاڑوں کی یہ متاع کائنات کے مالک کے ادنیٰ کرشموں میں سے ایک سمجھے بیٹھی تھی۔ پر اب جانا تھا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے تحت انسان فطرت کے ساتھ کیسے جنگ کرتا ہے۔

اس وقت وہ طور میک کے خوب صورت گاؤں بروق میں اس سلونے بوڑھے آدمی کے گھر بیٹھی تھی جو غلام حیدر کی چچی غلام فاطمہ کی خبر پرسی کے لئے آیا تھا۔ چمکتی سہ پہر کو وہ کوٹھے کی چھت پر پولو کا میچ دیکھنے چڑھی تھی۔ غلام فاطمہ کے گھر کے دروازے اس پولو گراؤنڈ کی طرف کھلتے تھے۔ جس میں زمانہ قدیم سے لے کر چند سال پیشتر تک راجہ روندو اپنے درباریوں اور پولو کے کھلاڑیوں کے ساتھ پولو کھیلتا تھا اور بروق کی خوب صورت سیر گاہ میں سیر کرتا تھا۔

آج بھی وہاں پولو کھیلا جا رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کھیلنے والے عام لوگ تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ ہوئی تھی کہ کسی نے کہا۔

''آج پولو میچ ہوگا۔'' وہ فوراً چھت پر چڑھ گئی۔ رہائشی مکانات کا سلسلہ کچھ اس طرح سے ہے۔ کہ انہوں نے پولو گراؤنڈ کو درمیان میں لے کر اسے جدید زمانے کے اسٹیڈیم کی صورت دے دی ہے۔ کم و بیش سبھی گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں گراؤنڈ کی طرف کھلتے ہیں۔

جب کھیل شروع ہوا تو اردگرد کی چھتوں اور گھروں کے برآمدوں میں لوگ نظر آنے لگے۔ رونڈو کے کھلاڑی تو یوں بھی بہترین کھیل کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ کھیل ابھی اختتام پر نہیں پہنچا تھا جب غلام حیدر نے اسے آواز دی۔ اس نے چھت پر سے جھانک کر پوچھا'' کیا بات ہے۔''

اور جواباً وہ بولا۔

'' نیچے آؤ تمہیں ایک دلچسپ اور نادر ہستی سے ملاؤں۔''

وہ کھیل کو ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ایسا سنسنی خیز کہ رگوں میں جما خون تک پگھلا ڈالے۔ گو اسے کھیل کے قواعد وضوابط سے ابھی مکمل واقفیت نہیں ہوئی تھی۔

وہ نیچے آئی۔ غلام حیدر کی طرح اس کی چچی غلام فاطمہ بھی بڑی تنہا تھی۔ چار بچوں کی ماں جس کا چھوٹا کنوارہ بیٹا ایران میں محنت مزدوری کرنے گیا ہوا تھا۔ بڑا شادی شدہ اپنے بچوں کے ساتھ کراچی میں، ایک لڑکی پنڈی میں اور دوسری گلگت میں اپنی اپنی گھرداری میں پھنسی تھیں۔

غلام فاطمہ کو دمے کی شکایت تھی۔ موسم جب بدلتا اس پر بیماری کا شدید دورہ پڑتا۔ غلام حیدر اور سکینہ سال میں دو تین بار تو اس کے پاس ضرور چکر لگاتے۔ انہوں نے بہتیرے طرے مارے تھے کہ کسی طرح وہ ان کے ساتھ چھوربٹ چلی جائے۔ پر وہ گھر چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھی۔ یوں بھی رونڈو کی وادی نسبتاً گرم ہونے کے ساتھ ساتھ میوہ جات کا گھر ہے غلام فاطمہ کا باغیچہ انگور، خوبانی، انار، سیب، ناشپاتی، اخروٹ اور شہتوت کے درختوں سے لدا کھڑا تھا۔

نیچے آکر اس نے دیکھا۔ ایک سانولا سا اونچا لمبا قدیم دردنسل کے سے نقش ونگار والا بوڑھا بیٹھا باتیں کرتا تھا۔ اس کی بولی گو سمجھ میں آتی تھی پر یہ بلتی زبان کی کمترین شکل تھی۔

غلام حیدر نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے جب یہ کہا تھا۔

''اس نے گلیشیئر پالے ہیں۔''

اس نے بھونچکی سی ہو کر اسے دیکھا اور بولی۔

''کمال ہے۔ یہ سچ ہے یا مذاق۔ گلیشیئر بھی کوئی کتے بلیاں یا بھیڑ بکریاں ہیں، جنہیں پالا جائے۔''

اور وہ کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔ ''یہ بھی دلچسپ کہانی ہے۔ سنوگی تو لطف اٹھاؤ گی۔''

باہر برسیکار کی مختلف دھنیں بج رہی تھیں۔ کھیل ختم ہو گیا تھا اور لوگ اب ناچ گا رہے تھے۔ وہ جھپٹ کی طرف بھاگی یہ کہتے ہوئے کہ آپ جب اپنے گھر جائیں۔ مجھے ساتھ لیتے جائیں۔ میں آج آپ سے یہ ضرور سنوں گی۔''

اور جب شام ڈھل رہی تھی وہ اس کے ساتھ جس کا نام مراد خان تھا، چھوٹے چھوٹے قدم الحتی بروق کی زمین کو قدموں تلے روندتی اس کے گھر جاتی تھی۔ غلام حیدر اس کے یوں تیار ہو جانے پر بہت ہنسا تھا اور وہ بولا تھا۔

''تمہاری پنجابی زبان میں ایک محاورہ ہے لو سنو۔''

''جتھے ویکھاں توا پرات، او تھے گاواں ساری رات۔''

ترجمہ:۔ یعنی جس جگہ بھی توا اور آٹے کی پرات دیکھ لوں، وہاں ساری رات گیت گاؤں۔''

اور باہر جب رات کی سیاہیاں اپنے آپ کو مخاطب کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے۔ ٹانگوں پر سیر مک کی لوئی ڈالے بغور اسے سنتی تھی۔ جو اپنے پوتے کو گود میں سلائے دھیمے دھیمے بول رہا تھا۔

''فلاں اتنی سرسبز و شاداب وادی اس وقت نہیں تھی جب میں ایک نوخیز سالڑکا تھا۔ بلتستان چونکہ ہمالیائی سلسلے کی پیٹھ پیچھے واقع ہے۔ اس لئے یہ مون سون کی نعمت سے محروم ہے یہاں پانی کی قلت ہے۔ ہماری وادی بھی پانی کی کمی کے باعث کھیتی باڑی میں کفیل نہ تھی۔ یہ

گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔گاؤں کے نوجوان ری سیر کا پروگرام بنانے میں مصروف تھے۔ری سیر دراصل نوجوان لڑکوں کا ایک تفریحی شغل ہے کہ جب پہاڑوں پر پھول کھلتے ہیں تو ہر گاؤں کے لڑکے بالے مل کر پکنک منانے کے لئے وہاں جاتے ہیں۔تین چار دن اوپر رہتے ہیں واپسی پر مینڈوق کار کی دھنوں پر تلوار کے ساتھ ناچتے ہوئے آتے ہیں۔وہ اپنے ساتھ پھولوں کے ہار اور گہنے بھی لاتے ہیں جو اکثر و بیشتر اپنی دل پسند لڑکیوں کو دیئے جاتے ہیں۔

گل بانو سے مجھے پیار ہی نہیں عشق تھا۔گرمیوں کی اس دوپہر کو جب ہم سب لڑکے پہاڑوں پر جانے اور وہاں سیر و تفریح کے پروگرام ترتیب دے رہے تھے، وہ آ ئی تھی۔میں نے دیکھا تھا اس کا برف جیسا سفید چہرہ چنار کے پھولوں جیسا ہو رہا تھا، اس نے بظاہر بقیہ لڑکوں کو حقیقتاً مجھے سناتے ہوئے کہا تھا۔"وادی خشک ہے۔اس کا ایک ایک پودا اور بوٹا پانی مانگتا ہے۔جو پانی ادھر ادھر سے آتا ہے وہ اس کے لئے ناکافی ہے۔بوڑھے تو ڈوگروں سے جنگ کرتے کرتے پست ہمت ہو گئے ہیں اور تم نوجوان لوگوں کو سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں۔بتاؤ وادی آب و دانہ میں کیونکر کفیل ہو۔کیا تم لوگ اپنے آباؤ اجداد کی طرح مصنوعی گلیشیئر نہیں پال سکتے؟ پال تو سکتے ہو پر ہڈ حرام ہو گئے ہو۔"

یہ بہت بڑا حملہ تھا جوان نسل کی عزت نفس اور پندار غرور پر۔

بس تو سب اٹھ گئے تھے۔کہاں کی سیر اور کہاں کے پروگرام سب ختم ہوئے۔اب ٹولہ اس جگہ کا متلاشی ہوا جہاں گلیشیئر پالا جائے اور اس سے ساری بستی فائدہ اٹھائے جگہ کا انتخاب ہوا۔قدیم ترین گلیشیئروں کے بارے میں بوڑھوں سے معلومات حاصل کی گئیں۔انہوں نے دو باتوں کی تاکید کی۔آج بھی جب یاد کرتا ہوں تو جمعو آتا روزی خان کی باتیں کانوں میں گونجنے لگتی ہیں۔

بچہ نیا خون ہے تمہارا مجھے امید ہے پرانے گلیشیئروں سے منوں وزنی یخ کے ٹکڑے لانے میں تمہیں تھکاوٹ تو محسوس نہیں ہوگی۔لیکن ہوئی تو ستانا نہیں۔ایک پل کے لئے کسی

جگہ رکنا بھی نہیں بس چلتے رہنا ہے مسلسل۔

دوسرے بچے! ہونٹوں کو بند رکھنا ہے۔ تم لڑکے بالے ہنسی مخول سے نہیں رکتے ہو۔ پر یاد رکھنا یخ لانے کے عمل میں بات چیت منع ہے۔''

میں ذرا منہ پھٹ قسم کا نوجوان تھا۔ بول اٹھا تھا۔ چھنو آتا! بھلا بولنے سے کیا ہو جائے گا؟ اور چھنو آتا روزی خان نے میری بات کا برا مناتے ہوئے کہا تھا۔

بچے بحث کی کیا بات ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آزمانا چاہتے ہو آزمالو گلیشیئر بھی پھل پھول گیا تو روزی خان کا نام بدل دینا۔

تیسری تاکید اور احتیاط جو ہوئی وہ یہ تھی کہ یخ کم از کم دو مختلف الجنس یعنی نر و مادہ، گلیشیئر وں سے علیحدہ علیحدہ لانا لازمی ہے۔ انہوں نے نر و مادہ گلیشیئر وں کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔

چلتے چلتے انہوں نے ہمیں یہ بھی کہا تھا۔ بچو خیال رکھنا یخ کے بوجھ کی تعداد بھی دونوں جنس کے گلیشیئر وں سے طاق عدد میں لانا ضروری ہے۔

مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گل بانو نے مجھ سے جانے کس جنم کا بدلہ لیا ہے۔ مگر اب تو اوکھلی میں سر دے دیا تھا۔

نر اور مادہ گلیشیئر وں سے منوں وزنی برف کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر لانے میں کس قدر دشواری ہوئی تھی۔ یہ یقیناً بتانے والی بات نہیں۔ دو ماہ اس کام میں لگ گئے۔ یخ کو دبانے کے لئے جب ہم پہاڑوں پر گڑھے کھودتے تھے۔ میرا ساتھی حسین بولا تھا۔

''اگر ان گڑھوں سے کہیں سونا نکل آئے تو ہم کتنے امیر ہو جائیں۔''

اور علی کاظم نے جواباً حسرت سے کہا تھا۔

''تو سمجھتا ہے ہم اتنے نصیب والے ہیں۔ ارے ہمارے مقدروں میں مزدوریاں ہیں، مزدوریاں۔''

یخ کو گڑھے میں دبانے کے بعد اس پر منوں کی تعداد میں کوئلہ اور بھوسہ ڈالا تھا۔ اس

کے اوپر ایک جھونپڑی بنائی تاکہ دبی ہوئی برف پر ہمہ وقت سایہ رہے۔ جب تک گرمیاں رہیں ہم مشکیزوں میں پانی بھر بھر کر اس پر یوں رکھتے کہ قطرہ قطرہ نیچے ٹپکتا رہے۔ جب برف باری کا موسم ہوا تو گزوں کے حساب سے کچی برف لا کر اس پر ڈالی۔ چار سال تک میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس گلیشیئر کی یوں دیکھ بھال کی، جیسے ماں اپنے پہلونٹھی کے بچے کی کرتی ہے۔ ہر چار ماہ بعد ہم یہ جاننے کے لئے مرے جاتے کہ یہ اب جڑیں مضبوط کر بیٹھا ہے اور بڑھنے اور پھیلنے کا عمل شروع ہو گیا ہے یا نہیں۔

پتہ نہیں کہ ہماری حد درجہ مخلصانہ کاوشوں کا نتیجہ تھا یا ہماری دعاؤں کا اثر تھا کہ وہ مصنوعی گلیشیئر اتنا پھیلا کہ قدرتی گلیشیئروں کو مات دے گیا۔

فلاں کی سرسبز وادی اس کی مرہون منت ہے۔

گل بانو مسکراتی ہوئی قہوے کی پیالیاں ہاتھوں میں پکڑے آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سنہری بھاپ اڑاتی پیالی تھماتے ہوئے وہ ہنسی تھی۔

اور میں نے چار سال تک اس گیت کے سہارے وقت کاٹا تھا۔ میں گاتی تھی۔

اومیرے خوب صورت مراد خان

میں سوچتی ہوں تمہیں وہاں پیاس لگے گی۔

میں پگلی تیرے لئے پینے کا پانی بن جاؤں۔

میرے مراد خان!

میں سوچتی ہوں تم وہاں دھوپ میں جلتے ہو گے

میں سوچتی ہوں تم وہاں تھک جاتے ہو گے

میں پگلی تیری سواری کے لئے گھوڑا بن جاؤں۔

لیکن میں کیا کروں؟

میں مراد خان سے دور ہوں۔



اس کے نہ نہ کرنے پر بھی غلام حیدر اور سکینہ اسے رونگ کھر دکھانے کے لئے گھسیٹ کر لے گئے۔ اس نے بہتیرا شور مچایا کہ وہ کھروں کو دیکھنے تو ہرگز نہیں جائے گی۔ لیکن انہوں نے بھی اس کی ایک نہ چلنے دی۔ ساتھ لے کر ہی ٹلے۔

رونگ کھر کشمیری اور بلتی طرز تعمیر کا دل کش مرقع جو مہندی اور دریائے سندھ کے درمیان ایک اونچے مقام پر واقع ہے۔ ٹوٹی پھوٹی صورت میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ غلام حیدر سے جھگڑتی تھی کہ اب یہاں دیکھنے والی کیا شے تھی۔ کرب اندر سے چھلک کر باہر آ جاتا تھا۔

غلام حیدر مردان خانے اور زنان خانے اسے دکھاتے ہوئے کہتا تھا۔

ارے بابا آثار قدیمہ میں بھی دلچسپی رکھو۔ یہ بھی تو عبرت کی جگہیں ہیں۔ ان سے بھی کچھ سیکھنے کی کوشش کرو۔ دیکھو غور سے دیکھو یہ دیوان عام اور دیوان خاص ان بالکونیوں اور شہ نشیوں والی غلام گردشوں کو۔ تمہیں شاید تھوڑا سا اندازہ ہو کہ ان میں رہنے والوں پر وہ وقت بھی آیا کہ جب ان کے اپنے اعمال کی بدولت ڈوگرہ فوج غالب ہوئی۔ انہوں نے اس سات منزلہ عالیشان محل میں بسنے والوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے مضبوط محلوں اور قلعوں سے نکل کر نشیبی علاقوں میں رہیں۔ راجہ علی شاہ کو یہ محل چھوڑنا پڑا تھا۔ یوں یہ بیسیوں سالوں تک غیر آباد اور ویران پڑا رہا اور اب زمانے کی گردش کے ہاتھوں بوسیدہ ہو کر کھنڈرات میں بدل گیا ہے۔

غلام حیدر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

میری بیٹی! تو ابھی سے حوصلہ ہارے بیٹھی ہے۔ ارے ابھی تو میں تمہیں سیق لے جانا چاہتا ہوں۔ طورمیک سے زیادہ دور نہیں علی شیر خان نے جب گلگت اور چترال کو فتح کیا تو ان علاقوں کی نگرانی کے لئے استک میں نالہ کے کنارے اونچی جگہ پر بہت مضبوط اور مستحکم قلعہ بنوایا۔

چھوڑو بھی تی تی آ تا۔ کوئی پُر فضا پُر رونق اور دلفریب جگہ دکھاؤ کیا کھروں اور قلعوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔

اور جب وہ لوگ واپس آ رہے تھے۔ سکینہ نے کہا۔

میرا خیال ہے دو تین دنوں تک ہمیں اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔

غلام حیدر بولا۔

چچی چاہتی ہے ہم پندرہ شعبان کا تہوار منا کر جائیں۔ میرے خیال میں تو چودہ شعبان میں چند دن باقی ہیں۔

سکینہ چپکی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے یہ کہا کہ وہ یہ اہم مذہبی تہوار اپنے گھر جا کر خصوصی اہتمام سے منانے کی متمنی ہے۔ تو غلام حیدر نے غصے سے بھڑک کر یہ ضرور کہنا ہے۔

''سکینہ یہ بھی تو اپنا گھر ہے۔''

جب وہ لوگ گھر پہنچے غلام فاطمہ کے پاس ترنہ (سیکرٹری تنظیم مذہبی رسومات) بیٹھا ہوا تھا وہ عرس کی شام کو خیراتی کھانے کے لئے چندہ لینے آیا تھا۔ غلام فاطمہ نے اس سے کہا تھا۔

''میں چاہتی ہوں اس بار یہ کھانا میں دوں اور قصیدہ خوانی کی محفل سب سے پہلے میرے گھر میں منعقد ہو۔ بس یوں لگتا ہے جیسے یہ میری زندگی کا آخری سال ہو۔

تین شعبان سے قصیدہ خوانی کی محفلوں کا زور دشور شروع ہو گیا۔ نو شعبان کو جناب عارف الحسینی سکردو سے رونق تشریف لا رہے تھے۔ ایک جید عالم کے استقبال کی تیاریاں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔

چودہ شعبان کو غلام فاطمہ کے گھر کی عقبی گراؤنڈ میں بہت بڑا اجتماع ہوا۔ گوشت کی

دیگیں پکیں۔تنور کی روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے میں اس نے بھی زوروشور سے حصہ لیا۔

بڑی بڑی سینیوں میں شوربہ ڈال کر روٹیوں کے ٹکڑے بھگو دیے گئے۔ایک ایک سینی پر پانچ پانچ مرد بیٹھے بوٹیاں ان کے ہاتھوں میں دی گئیں۔یہ سب دیکھ کر اس نے سکینہ سے کہا۔

''بھلا آمو! بوٹیاں بھی سینی میں رکھ دی جائیں تو کچھ حرج ہے۔''

''ہاں بٹی! حرج ہے۔طاقتور ساری کھا جائے گا اور بے چارہ مسکین منہ دیکھتا رہ جائے گا۔ہاتھوں میں دینے سے مساوات کا عمل پورا ہوتا ہے۔''

چودہ شعبان کو تہوار منا کر وہ واپسی کی تیاریوں میں تھے۔غلام فاطمہ کی طبیعت اب بہتر تھی یوں وہ چاہتی تھی کہ وہ کچھ دن اور رہ جائیں لیکن سکینہ کو اب جلدی تھی۔گائیں اور بھیڑ بکریاں دادی جواری کے منجھلے بیٹے کے سپرد کی گئی تھیں۔گائے نئے دودھ ہونے والی تھی۔

توت ابھی زیادہ نہیں پکے تھے۔پھر بھی ان میں رس اور مٹھاس کافی تھی۔غلام فاطمہ نے ڈھیر سارے تڑوا کر لفافے میں بھر دیے۔

اور وقت رخصت غلام فاطمہ نے تانبے کا خوب صورت سا دار جس پر نہایت نفیس کندہ کاری کی ہوئی تھی، اسے تحفہ دیا۔اس کا ماتھا چوما اور پھر آنے کی تاکید کی۔



بڑی بھابھی اور للّی لاہور جا رہی تھیں۔ بڑی بھابھی کا مائیکہ لاہور کی نواحی آبادی شاہدرہ میں تھا۔ وہ لوگ رونددو سے کل دوپہر سکردو پہنچے تھے۔ سکینہ کا خیال اگلے دن چلے جانے کا تھا لیکن اس کی خواہش پر وہ دونوں کے لئے رک گئی۔ صبح سویرے ایئر پورٹ پر جانے کے لئے سیماں نے اس کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔ سات بج کر دس منٹ پر جہاز کی آمد تھی اور ٹھیک آٹھ بجے پنڈی کے لئے روانگی۔

روح اللہ کے ساتھ وہ چاروں جب ایئر پورٹ پہنچیں۔ چمکتی دھوپ میں چمکتے ایئر پورٹ کو دیکھ کر اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ پہلی بار یہاں آئی تھی۔ اس وقت فضا، لوگ اور ماحول سبھی کچھ اجنبی تھا۔ لیکن آج وہ ان سب کے ساتھ رچی بسی بیٹھی تھی۔ یوں یہ اور بات تھی کہ کبھی کبھی اسے احساس ہوتا جیسے وہ ایک گہرے سمندر میں بندھے ہاتھ پاؤں کے ساتھ پانی کی لہروں پر ڈگمگاتی پھر رہی ہے، اور نہیں جانتی کہ ڈوب جائے گی، یا کسی کنارے پر پہنچ پائے گی۔

اور آسمان کی لامحدود وسعتوں پر جب اس نے نگاہ ڈالی، اسے بہت دور وہ مشینی پرندہ نظر آیا تھا جو اپنے سینے میں سیکڑوں انسانوں کو سموئے ہوئے تھا۔ فضا میں شور اور گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی۔ زمین پر ہلچل مچی۔ اور سروں پر منڈلاتا ہوا وہ زمین پر آ گیا۔

کچھ نئے نویلے جوڑے مقامی لوگ پھر دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چکرا کر زمین پر گرنے والی ہے۔ اس نے سیماں کو پکڑ لیا تھا۔ سیماں نے گھبرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سفید پڑا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' سیماں نے اسے فی الفور اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اس نے سر جھٹکا، لمبی سانس لی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''کچھ نہیں جان، بس ذرا چکر آ گیا تھا۔''

بڑی بھابھی روح اللہ کے ساتھ اندر چلی گئی تھیں۔ سیماں یہ جاننے کے لئے، مضطرب تھی کہ آخر اسے ہوا کیا؟ اس نے ایک بار نہیں جب کئی بار اس سے پوچھا۔ تب اس نے کہا۔

''سیماں میں نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو دیکھا ہے۔ ساتھ میں کوئی مرد بھی ہے۔ شاید اس کی شادی ہو گئی ہے۔''

''کہاں کدھر؟'' وہ بے تابی سے بولی۔ اور پھر اس کا بازو کھینچ کر اسے عمارت کی جانب گھسیٹتے ہوئے بولی۔

''آؤ نا اس سے ملتے ہیں کچھ معلوم تو ہو تمہارے بعد کیا ہوا؟''

اور ثریا نے اسے اپنے سامنے دیکھ کر عجیب سی بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ اس کی صورت دیکھتے ہی اس سے لپٹ جائے گی۔ اس کے یوں غائب ہو جانے کا سبب پوچھے گی۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو ہوں گے۔ جو کہف الوریٰ کو یقیناً یہ بتائیں گے کہ خونی رشتوں کا تقدس ابھی پامال نہیں ہوا۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ثریا کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم سے تھے۔ اس کا ناٹے سے قد کا خاوند البتہ کافی خوش اخلاق اور ملنسار سا نظر آتا تھا۔ وہ شاید ڈاکٹر تھا۔ ثریا نے تعارف کرواتے ہوئے یہی کہا ڈاکٹر ریاض میرے شوہر۔

اور ڈاکٹر ریاض کی آنکھوں سے جھلکتے اس سوال پر کہ وہ کون ہے۔ ثریا ایک لمحہ توقف کیئے بغیر بولی تھی۔

''میری کزن ہے۔ یہاں سروس کرتی ہے۔''

اور ڈاکٹر ریاض نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

بارے میں ایسی ایسی باتیں خاندان میں پھیلائیں کہ جنہیں سن کر ہی انسان مارے کراہت کے منہ بگاڑے۔ثریا نے یہ بھی بتایا کہ رشتہ داروں کو تو یہ تاثر ملا ہوا ہے کہ وہ اپنے یونیورسٹی کے زمانے کے کسی عاشق کے پاس چلی گئی ہے اور شادی کر بیٹھی ہے۔

وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق پھٹی پھٹی آنکھوں سے ثریا کو دیکھتی تھی۔اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ایک پل میں اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھرنے والا ہے۔

سیماں جیسے تڑپ کر بولی۔

''ارے رشتہ دار کیا اندھے گونگے اور بہرے ہیں۔فہم سوجھ بوجھ اور پرکھ جیسے اوصاف سے خالی ہیں۔سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے سے عاری ہیں۔نہیں جانتے ہیں یہ کیسی ہے میں اس کی رشتہ دار نہیں میرے پاس یہ گزشتہ ایک سال سے ہے۔میں تو بہت کچھ جانتی ہوں اس کے متعلق۔

ثریا شرمساری نظر آتی تھی۔سیماں جیسی تیز طرار اور کھری کھری باتیں کہہ دینے والی بھلا اسے کہیں بخشتی۔اس نے جی بھر کر سب کو لتاڑا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ لوگ چلے گئے۔انہیں چھوڑنے صرف روح اللہ ہی گیا تھا۔روح اللہ کا خیال تھا کہ انہیں رات کے کھانے کا کہا جائے۔لیکن سیماں نے منع کر دیا۔

وہ گم صم ہو گئی تھی۔سیماں محسوس کرتی تھی کہ اس نے اپنے دل پر اثر لیا ہے۔

وہ اس کے قریب آئی۔اس کی آنکھوں میں جھانکا،اس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں تھاما اور بولی۔

''میری جان! یہ دنیا ہے خود غرضی اور مفاد کے دامن سے لپٹی دنیا۔''

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کاٹتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

''تم روح اللہ،تمہارے گھر کے افراد،غلام حیدر اور سکینہ،شاہ جہاں اور اس کا گھرانہ کیا ماورائی مخلوق ہیں۔تمہارا اس دنیا میں شمار نہیں۔سیماں میری جان! دنیا کو اتنا خراب مت کہو۔اس میں تم جیسے لوگ بھی ہیں۔''

سکینہ حیران تھی کہ اسے کیا ہوا ہے؟ غلام حیدر تو کسی سے ملنے گیا ہوا تھا۔ وہ تو صورت حال سے یکسر بے خبر تھا۔ لیکن سکینہ کا اندر بوٹیوں میں کٹتا تھا۔ وہ بار بار سیماں سے پوچھتی تھی کہ آخر آنے والی نے کیا باتیں کی ہیں، جو یہ یوں چُپ سادھ بیٹھی ہے۔

دوپہر کے کھانے پر اس نے معذرت کر دی۔ سیماں اور سکینہ نے صرف ایک نوالہ کھانے کے لئے اس کی منتیں کیں۔ سیماں اس کی خوفناک قسم کی خاموشی سے خوفزدہ سی تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ دوسروں پر اپنا غم ظاہر کئے بغیر اندر ہی گھلنے والے لوگوں میں سے ہے۔ اسی لئے وہ چاہ رہی تھی کہ وہ باتیں کرے۔ اپنے غم و غصے کا اظہار کرے۔ دل کی بھڑاس نکالے۔ روئے اور ہلکی ہو جائے۔

پر وہ کوئی اتھلا انسان تھی۔ اس نے تو خود پر ضبط کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس وقت اسے اگر فکر لاحق تھی تو صرف یہ کہ بلاوجہ ان لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بنی ہے غلام حیدر اور سکینہ اس کے لئے پریشان ہیں۔ بھلا وہ اگر انہیں خوشیاں نہیں دے سکتی تو اسے غم دینے کا بھی حق نہیں۔

وہ یہاں سے چلی جائے ابھی اور اسی وقت لیکن وہ اتنے سارے من موہنے لوگوں کے جذبات کچل کر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ چپ چپاتے نکل جانے کے لئے وقت درکار تھا۔

اسے تو یہ بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ رشتوں کا مان زور داران کا بھرم کیا صرف اس وقت تک ہے۔ جب تک انہیں چُوری ملتی ہے یا کوئی زبردست انہیں بزور بازو منواتا رہے۔ اس کی یہی پھوپھی جس کی بیٹی نے آج اس سے اچھوتوں جیسا سلوک کیا۔ اس کے باپ کی زندگی میں کیسے واری صدقے ہوتی تھی۔

اب کون تھا؟ بھلا وہ اس کے لئے اس کی صاحب جائیداد بھاوج اور سسرال سے کیوں بگاڑتی۔ زبردست کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی توفیق تو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔



اور پھر وہی ہوا تھا جس کا سیماں کو ڈر تھا۔ شاید اسی لئے وہ چاہتی تھی کہ وہ اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی غم والم کی گھٹا یا تو اپنی زبان کے راستے آندھی کی صورت میں اڑا دے۔ یا پھر آنکھوں کے ذریعے آنسوؤں کی بارش سے ہلکی کر دے۔

وہ لیٹ گئی تھی۔ سکینہ اس کے پاس ہی قالین پر بیٹھی تھی۔ جب بھی وہ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتی۔ وہ آنکھوں سے اسے ''ٹھیک ہوں'' کا اشارہ دیتی۔ چار بجے کی چائے جب للی اس کے لئے لائی۔ تو اس کی چیخ سی نکل گئی۔ اس کا چہرہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اور وہ بے ہوش تھی۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان جب سیماں کو اس امر کی اطلاع دی تو وہ بھاگتی ہوئی آئی۔ سکینہ کمرے میں نہیں تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی سیماں ''روح اللہ دیکھو تو سہی آ کر'' کہتے ہوئے اس زور سے چلّائی تھی کہ روح اللہ اپنے کمرے سے اور سکینہ باہر لان سے کمرے میں بھاگتے ہوئے آئے تھے۔

سیماں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے اسے آوازیں دیتی اور جھنجھوڑتی تھی۔ سکینہ پاس کھڑی سینہ کوٹتی تھی۔ روح اللہ بوکھلایا ہوا ڈاکٹر کو فون کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کے فوراً پہنچنے کا سن کر وہ کمرے میں آیا۔ سیماں کا اضطراب دیکھ اس نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

''کیا احمقوں کی طرح واویلا مچایا ہوا ہے۔ ہاتھ پیر پھلا دیئے ہیں۔ تحمل اور برداشت سیکھو۔''

ڈاکٹر نے آ کر معائنہ کیا حالات پوچھے۔ سیماں نے اصلی واقعات کو چھپاتے ہوئے یہ بتایا۔ ان کی کزن نے کسی عزیز کی ناگہانی موت کی اطلاع دی تھی۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اسپتال لے جانا بہت ضروری ہے۔

ایمبولینس آئی اور لے گئی۔ اسے سکردو اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں

رکھا گیا۔

سیماں کو کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ اس نے روح اللہ سے بات کی کہ ڈاکٹر ابراہیم کو فون کر دوں۔ اس نے کہا۔ ''رہنے دو، ابھی ضرورت نہیں۔''

لیکن سیماں کو کہاں قرار تھا۔ روح اللہ جب دوبارہ اسپتال گیا اس نے خیلو فون کر دیا۔ ڈاکٹر ابراہیم سے ہی بات ہوئی انہوں نے سن کر صرف اتنا کہا۔ ''میں فوراً پہنچ رہا ہوں گھبرانا نہیں۔''

رات آٹھ بجے وہ خپلو سے چلے اور دو بجے سکردو پہنچے۔ سیدھے اسپتال آئے۔ اسے دیکھا۔ ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ سکینہ کمرے میں بنچ پر بیٹھی غالباً قرآنی آیات پڑھتی تھی۔ سیماں ایک بجے اسپتال سے گئی تھی۔ غلام حیدر کو بھی سیماں زبردستی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

صبح دس بجے اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ ہر سُو ایک غبار سا پھیلا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس غبار میں ایک چہرہ اسے ڈاکٹر ابراہیم کا نظر آیا تھا جو کسی سنگی بت کی طرح اس کے بیڈ کے پاس ایستادہ تھا۔

دوسرا سکینہ کا چہرہ تھا جو اس سے دور لکڑی کی بنچ پر بیٹھا تھا۔ دونوں چہروں کے تاثرات کیا تھے۔ یہ سمجھ آنے سے پہلے وہ پھر غنودگی کے دریا میں غوطہ مار گئی تھی۔

چار بجے اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔ ہوش کا یہ وقفہ نہ صرف طویل تھا بلکہ اس میں غبار بھی بہت کم محسوس ہوا تھا۔ سیماں، روح اللہ، غلام حیدر، سکینہ سبھی کو اس نے نہ صرف پہچانا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ ٹھیک ہے۔

سیماں اس کے چہرے پر جھکی کہتی تھی۔ ''دیکھو ہم سب تمہارے لئے فکر مند ہیں، پریشان ہیں۔ خدا کے لئے ہم پر رحم کرو۔ ہمارے لئے زندہ رہو۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔''

ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر ابراہیم آئے۔ وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی رگ رگ میں سے کسی نے توانائی کی حرارت کشید کر لی تھی۔

وہ جھکے اس کی آنکھوں میں جھانکے اور لہجے میں شہد جیسی مٹھاس گھولتے ہوئے بولے۔

''ارے میں تو تمہیں بہت بہادر اور دلیر سمجھتا تھا۔''

''دلیر تو میں ہوں ڈاکٹر صاحب! بس چاہنے والوں کی محبت اور خلوص نے بزدل بنا دیا ہے۔''

ڈاکٹر ابراہیم جس جانفشانی سے اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے، وہ اس پر شرمسار تھی۔ ایک دن کہہ بیٹھی۔

''آپ مجھ پر احسان پر احسان کئے جا رہے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی میں ان کا بدلہ کیونکر اور کیسے چکا سکوں گی؟''

وہ اس وقت اسے انجکشن لگانے کی تیاری میں تھے۔ ان کا ہاتھ اک ذرا رکا۔ ان کے چہرے کا رنگ بھی اس بات پر کچھ عجیب سا ہوا۔ تاہم وہ اپنے اسی متحمل انداز میں بولے تھے۔

''آپ کا علاج اور دیکھ بھال ڈاکٹر ہونے کے ناطے میرا فرض ہے۔ میں اسے احسان یا مرعوب کرنے کے کھاتے میں تو ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کے لئے آپ بھی ایسا مت سوچیں۔''

سرخ کمبل اس کے ہونٹوں تک کھنچا ہوا تھا۔ وہ سامنے دیوار پر ٹنگی اس تصویر کو دیکھتی تھی۔ جس پر کے ٹو کی چوٹیوں کے برفانی حصے نمایاں تھے۔ کمرہ چھوٹا ہونے کے باوجود بہت آرام دہ تھا۔ سکینہ کو اس نے زبردستی گھر بھیجا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ فی الفور چارپائی سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ اس کی بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں، جن کا خیال اُسے روزمرہ ہلکان رکھتا تھا، سب اس کے دماغ سے محو ہوئے بیٹھے تھے۔ اُس نے بہتر زور دیا تھا کہ وہ دونوں چھوڑ بٹ چلے جائیں۔ وہ اب کچھ بہتر ہے۔ ذرا اور ٹھیک ہونے پر فوراً ان کے پاس پہنچ جائے گی لیکن وہ دونوں اس کی بات پر کان نہیں دھرتے تھے۔

سیماں اور روح اللہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں واقعات اور حادثات نے خونی اور غیر خونی رشتوں کے بارے میں جو وضاحت کی تھی، اس نے

کئی مقولوں اور محاوروں کے بخیئے اُدھیڑ ڈالے تھے۔ بس ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اغراض کے سامنے انسان کس قدر پست ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ابراہیم کے بارے میں وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ جب بھی اس کا ذہن اس موضوع پر آیا۔ اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں اور گلا رُندھ گیا۔

پھر ایک دن جب وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ ڈاکٹر ابراہیم کمرے میں آئے۔ اسے سوتا دیکھ کر جانے لگے۔ جب اس نے آنکھیں کھول کر انہیں آواز دی۔ وہ واپس پلٹے اور بولے ''میں نے سوچا تھا چائے آپ کے ساتھ پیوں۔''

نوکر برتنوں کی ٹرے اندر لایا۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھے۔ چائے بنائی۔ ایک کپ اسے دیا اور دوسرا خود پکڑا چائے کا گھونٹ لیا اور بولے۔

''خدا کا شکر ہے کہ علاج کے سلسلے میں آپکا جوابی رویّہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ آپ کی بحالی صحت کی اس تیز رفتاری کی مجھے امید نہیں تھی۔''

''کبھی کبھی اپنے لئے نہیں، دوسروں کے لئے جینا پڑتا ہے۔ مجھے شدت سے احساس ہوا تھا کہ کچھ لوگ صرف میرے لئے پریشان ہیں۔''

ڈاکٹر ابراہیم نے خالی کپ ٹرے میں رکھا۔ کمر کرسی سے ٹکائی اسے دیکھا۔ اس نے فی الفور اپنی نگاہوں کا رخ بدل لیا۔

''کیف الوریٰ۔'' ان کی آواز اسے یوں محسوس ہوئی تھی، جیسے بہت دور سے آتی ہو۔

''ایک بار پھر آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

اس کے چہرے پر دُکھ کی بے چارگی پھیل گئی۔ جب اس نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں ٹوٹی پھوٹی عورت ہوں۔ پریشان اور شکستہ حال۔''

اس کی آواز بھی دُکھ سے بوجھل تھی۔

وہ خفیف سا ہنسے۔ یہ ہنسی یاس بھری تھی۔

''مجھے ٹوٹی پھوٹی چیزیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ میں چھوٹا سا تھا۔ جب میں مکمل اور

ثابت کھلونوں کی بجائے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے کھیلا کرتا۔ میری کوشش ہوتی میں انہیں، کسی طرح جوڑ دوں۔"

آپ مجھے آزمائش میں ڈالتے ہیں معلوم نہیں سیماں نے آپ کو یہ بتایا ہے یا نہیں کہ مجھے کلر اور شورزدہ زمین کا خطاب مل چکا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی آ گیا تھا۔

انہوں نے لمبی سانس بھری تھی۔ اس کی بجائے اپنے سامنے دیکھا تھا اور کہا تھا۔

"کہف الوریٰ! مجھے بچوں کی تمنا نہیں۔ بلتستان کے ہزاروں بھوکے ننگے علم سے محروم بچے، میرے بچے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ مل کر انہیں بھوک، بیماری اور جہالت کی دنیا سے نکال کر پاکستان کے قابل فخر شہری بنانا چاہتا ہوں۔ آپ کی ممتا اس عظیم صدقہ جاریہ پر طمانیت اور سرشاری محسوس کرے گی۔"

اس کے ہونٹ کپکپائے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب امنڈا۔

وہ اٹھے، اس کے پاس بیٹھے، اپنے ہاتھوں سے انہوں نے اس کی آنکھیں صاف کیں۔ لیکن وہ ضبط کا بند توڑ بیٹھی تھی۔ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اور اگر پھر بھی آپ کو اپنے بچے کی تمنا رہی تو میں خدا سے آپ کے لئے بچہ مانگوں گا اور یقیناً میں محروم نہیں ہوں گا۔"

پھر جیسے ان کی اپنی آواز خوابناک سی ہو گئی تھی۔ وہ بول رہے تھے۔

"اس وقت جب گروہی، صوبائی اور لسانی تعصبات کی آندھیاں آنکھوں میں ریت اور مٹی ڈال کر بینائی متاثر کر رہی ہیں۔ آؤ کہف الوریٰ ہم نئی نسل تیار کریں۔ جوذات کے حصار سے نکل کر مجمع میں کھو جائے۔ انفرادی سود سے بالا ہو کر اجتماعی زیاں پر قربان ہو جائے۔"

حرفِ آخر مارچ 1986ء

971 آشیانہ دہلی روڈ لاہور چھاؤنی